

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَاكَلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ
بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ

دور حاضر کے مالی معاملات کا شرعی حکم

حافظ ذوالفقار علی



دورِ حاضر کے مالی معاملات کا شرعی حکم

حافظ ذوالفقار علی حفظہ اللہ

ناشر
ابو ہریرہ اکیڈمی

37۔ کریم بلاک اقبال ٹاؤن لاہور۔ 042-5417233

WWW.KITABOSUNNAT.COM

253

جملہ حقوق محفوظ ہیں

7-10-13

نام کتاب: ----- دورِ حاضر کے مالی معاملات کا شرعی حکم

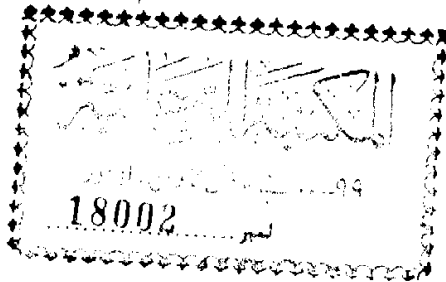
مؤلف: ----- حافظ ذوالفقار علی

ایڈیشن: ----- اول - ستمبر 2008ء

تعداد: ----- 1100/-

قیمت: -----

کمپوزنگ: ----- ناظم شہزاد



ناشر

ابو ہریرہ اکیڈمی

37- کریم بلاک اقبال ٹاؤن لاہور

فون: 042-5417233

فہرست مضامین

- پیش لفظ ----- 12
 ارشاد باری تعالیٰ ----- 14
 فرمودات نبویہ ﷺ ----- 15
 باب اول: ----- 16

اسلام اور جدید مسائل

- خصوصیات اسلام ----- 16
 (۱) عالم گیریت ----- 16
 (۲) ابدیت ----- 18
 (۳) جامعیت اور ہمہ گیریت ----- 18
 اسلام اور معیشت و تجارت ----- 20
 بعض شبہات کا ازالہ ----- 21
 جواب ----- 22
 کاروبار کی جو صورت شریعت کی ہدایات یا مقاصد کے خلاف نہ ہو وہ جائز ہے ----- 22
 دوسرا شبہ ----- 25
 خلاصہ ----- 26
 باب دوم: ----- 27

مالی معاملات کے بنیادی اصول

- ربا (سود) ----- 28
 سود کی حرمت پر اجماع ہے ----- 30

4 مروجہ معاملات کا شرعی حکم

- 31-----ربا کا معنی و مفہوم
- 31-----قرآن کی روشنی میں ربا الفضل کا حکم
- 32-----احادیث میں ربا الفضل کا حکم
- 33-----ربا الفضل کیوں حرام ہے؟
- 34-----بظاہر یکساں چیزوں کا تبادلہ
- 34-----ربا الفضل کا دائرہ
- 35-----کیا ربا کی حقیقت واضح نہیں؟
- 39-----عَرَدَ (uncertainty)
- 40-----غرر کا معنی
- 44-----غرر کا دائرہ
- 45-----مشکوک معاملات سے بھی پرہیز ضروری ہے
- 46-----خلاصہ
- 47-----باب سوم :

مروجہ معاملات کی تفصیل

- 47-----کریڈٹ کارڈ
- 47-----کریڈٹ کارڈ کی حقیقت
- 48-----کریڈٹ کارڈ کی تاریخ
- 49-----کارڈز کی مختلف قسمیں
- 49-----سودی (۱)
- 49-----غیر سودی (۲)
- 50-----کارڈز کے فوائد
- 50-----بینک کو حاصل ہونے والے فوائد



- 50----- تاجر کا فائدہ
- 50----- کارڈ ہولڈر کو پہنچنے والے فوائد
- 51----- کارڈز کے نقصانات
- 51----- کریڈٹ اور چارج کارڈز کا شرعی حکم
- 52----- ڈیبٹ کارڈ (Debit Card) کا استعمال جائز ہے
- 53----- انشورنس (التأمين)
- 53----- انشورنس کی ابتدا
- 55----- انشورنس کا مفہوم
- 56----- انشورنس کی قسمیں
- 56----- (۱) گروپ انشورنس
- 56----- (۲) میوچل انشورنس
- 57----- (۳) کمرشل انشورنس
- 57----- لائف انشورنس
- 57----- گڈز انشورنس
- 58----- تھرو پارٹی انشورنس
- 58----- کمرشل انشورنس کا شرعی حکم
- 59----- لیزنگ
- 60----- لیزنگ کا جدید مفہوم
- 61----- ایک شبہ کا ازالہ
- 62----- لیزنگ کا متبادل
- 62----- مروجہ لیزنگ کا دوسرا متبادل
- 63----- شیئرز (حصص) کی خرید و فروخت
- 63----- شیئرز کی تاریخ



- 63----- شیرز کی حقیقت
- 64----- شرعی حکم
- 66----- شیرز کی خرید و فروخت کی بعض ناجائز صورتیں
- 66----- فیوچر سیل
- 66----- بدلہ (Carey Over)
- 68----- کاروباری دستاویزات
- 68----- کاروباری دستاویزات سے مراد
- 69----- اوراق تجارتیہ کی تاریخ ابتداء
- 70----- کاروباری دستاویزات اور کاغذی کرنسی میں فرق
- 70----- کمرشل اور فنانشل پیپرز کا باہمی فرق
- 71----- کمرشل پیپرز کی مختلف قسمیں اور ان میں باہمی فرق
- 72----- ہنڈی
- 73----- پرومٹری نوٹ
- 73----- چیک
- 74----- شرعی حکم
- 76----- بینک کی وساطت سے وصولی کا حکم
- 77----- ایک شبہ کا ازالہ
- 77----- ہنڈی بھنانے کا حکم
- 78----- بعض شبہات کا ازالہ
- 79----- جواب
- 80----- دوسرا شبہ
- 80----- جواب
- 80----- تیسرا شبہ



81	جواب
84	حقوق کی بیع
84	حق التالیف
85	حق التالیف کی تاریخ
86	حق ایجاد
86	تجارتی نام اور علامات
87	معنوی حقوق کی بیع کا شرعی حکم
88	تاکلین کے دلائل
89	مانعین کے دلائل
89	راجح رائے
91	گپڑی
91	اراضی وقف میں گپڑی کی صورتیں
91	اراضی بیت المال میں گپڑی کی صورت
92	ذاتی پراپرٹی میں گپڑی کا مفہوم
92	گپڑی کا فائدہ
92	گپڑی کے مختلف نام
93	گپڑی کی تاریخ و ارتقاء
95	گپڑی کا حکم
98	ملاحظہ
99	بیع قسط
99	پہلا واقعہ
100	دوسرا واقعہ
101	قسطوں پر خریداری کی مختلف صورتیں



- 102 ----- قائلین جواز کے دلائل
- 103 ----- مانعین کے دلائل
- 104 ----- رائج نقطہ نظر
- 108 ----- ملاحظہ
- 108 ----- خلاصہ
- 110 ----- باب چھادم:



- 110 ----- تمہید
- 111 ----- اسلامی بینکوں پر تنقید کی وجوہ
- 111 ----- اسلامی بینکوں میں رائج اجارہ کا مقصد تمویل (فنانسنگ) ہے نہ کہ حقیقی اجارہ
- 112 ----- شرح سود کو معیار بنانا
- 114 ----- اسلامی بینکوں کا طریقہ بھی سودی بینکوں جیسا ہے
- 115 ----- تاخیر پر جرمانہ
- 115 ----- شریعت میں تاخیر پر جرمانہ کا تصور نہیں ہے
- 117 ----- امام خطاب رحمہ اللہ کے قول سے غلط استدلال
- 118 ----- اسلامی بینک نان رسک ہیں
- 119 ----- اسلامی بینکوں میں رائج طریقہ ہائے تمویل کی حقیقت
- 119 ----- مضاربہ
- 121 ----- مضارب کی حیثیت
- 121 ----- مضاربہ کی شرطیں
- 122 ----- مضاربہ کا میدان
- 126 ----- اسلامی بینکوں میں رائج مضاربہ کی حقیقت

- 129 ----- مراجعہ
- 129 ----- مراجعہ کی ضرورت اور اس کے بنیادی اصول
- 130 ----- مراجعہ کی مختلف قسمیں اور ان کا شرعی حکم
- 132 ----- رائج رائے
- 133 ----- مراجعہ میں ضمنی اخراجات کا حکم
- 133 ----- بیع مراجعہ اور بینکاری
- 134 ----- اسلامی بینکوں میں رائج مراجعہ
- 136 ----- مروجہ مراجعہ کا شرعی حکم
- 142 ----- اسلامی بینکوں کا نقطہ نظر
- 144 ----- اجارہ مُنتَهِیۃً بِالتَّمْلِیْکِ
- 146 ----- اسلامی بینکوں میں رائج اجارہ اور سودی بینکوں میں رائج ہائر چیز میں فرق
- 146 ----- ملکیت منتقل ہونے کے طریقے
- 147 ----- ضَمَانِ جَدِّیَہ کا حکم
- 147 ----- اگر چیز تباہ ہو جائے یا قابل استعمال نہ رہے؟
- 148 ----- اجارہ منتہیۃً بالتملیک کا شرعی حکم
- 150 ----- مشارکہ متاقصہ (Diminishing Musharakah)
- 152 ----- مشارکہ متاقصہ شرکت کی کس قسم میں داخل ہے
- 152 ----- شركة العنان کیا ہے؟
- 154 ----- مشارکہ متاقصہ میں بینک اپنے حصے کے پونٹ کس قیمت پر بیچے گا
- 155 ----- بینک اپنا حصہ کس قیمت پر فروخت کرتا ہے
- 156 ----- تَوَرُّق
- 157 ----- تورق اور بیع عینہ میں فرق
- 159 ----- تورق کا شرعی حکم

دو حاضر کے مال معاملات کا شرعی حکم

10

- 160 رائج رائے -----
- 160 بینکوں میں تورق کا استعمال -----
- 162 شرعی حیثیت -----
- 162 بیع سلم -----
- 164 سلم کی اجازت کا فلسفہ -----
- 164 کیا سلم خلاف قیاس ہے؟ -----
- 165 سلم کی شرطیں -----
- 169 ملاحظہ -----
- 169 سلم اور استحصال میں فرق -----
- 169 سلم میں رہن اور ضمانت طلب کرنا -----
- 170 سلم میں قبضہ کی مدت -----
- 171 حوالگی میں تاخیر پر جرمانہ -----
- 172 قبضہ سے پہلے بیچنا -----
- 173 تجارت میں سلم کا استعمال -----
- 176 اسلامی بینکوں میں سلم کا استعمال -----
- 177 سلم متوازی -----
- 178 پراپیگنڈہ کا جواب -----
- 178 خلاصہ -----
- 180 باب پنجم: -----

تکافل: مروجہ اسلامی انشورنس

- 180 تکافل کا معنی و مفہوم -----
- 182 اسلام میں تکافل کی اہمیت -----

- 184 ----- اسلامی تکافل کی ہمہ گیریت
- 186 ----- تکافل کی مختلف صورتیں
- 187 ----- اسلامی تکافل کی خصوصیت
- 187 ----- مروجہ تکافل اور اس کا طریقہ کار
- 190 ----- مروجہ تکافل کی قسمیں
- 190 ----- فیملی تکافل
- 191 ----- جنرل تکافل
- 190 ----- کیا مروجہ تکافل سود اور غرر سے پاک ہے؟
- 192 ----- کیا یہ عقد معاوضہ نہیں؟
- 192 ----- ایک تاویل کا جواب
- 193 ----- کیا نقدی کو وقف کیا جاسکتا ہے؟
- 197 ----- صحیح موقف
- 198 ----- ایک شبہ کا ازالہ
- 201 ----- بعض تحقیق طلب مسائل
- 202 ----- ایک غیر معقول استدلال
- 202 ----- خلاصہ
- 203 ----- باب ششم

قرض کے مسائل

- 203 ----- قرض لینا پسندیدہ نہیں
- 206 ----- قرض کی ادائیگی کا معیار



بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

مسلمان ہونے کے ناطے ہمارا یہ پختہ اعتقاد ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، سیاسی ہو یا اخلاقی، معاشرتی ہو یا معاشی جس کے متعلق دین میں اصولی رہنمائی موجود نہ ہو۔ مثلاً معیشت و تجارت کو لے لیجیے قرآن و حدیث میں اس حوالے سے واضح، غیر مبہم اور قطعی اصول بیان ہوئے ہیں جن کی روشنی میں ہم ہر دور میں پیش آنے والے مسائل کا حل تلاش کر سکتے ہیں۔ ہمارے محدثین کا یہ عظیم کارنامہ ہے کہ انہوں نے عبادات ہی کی طرح معاملات سے متعلق احادیث نبویہ ﷺ بھی ہم تک پہنچائی ہیں۔

کتب حدیث میں معاملات کے ابواب کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ جب تک معاملات درست نہ ہوں انسان کا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس کی زندگی اسلامی زندگی بن سکتی ہے۔ ہمارے پیارے نبی ﷺ نے حرام کے علاوہ مشتبہ امور کے ارتکاب کو بھی انسان کے دین اور آبرو کے لیے خطرے کی علامت قرار دیا ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔

((فَمَنْ اتَّقَى الْمُسْتَبْهَاتِ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ وَعِرْضِهِ، وَمَنْ وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ كَرَّاعَ يَرْعَى حَوْلَ الْحِمَى، يُوشِكُ أَنْ يُوَاقِعَهُ)) [صحیح بخاری:

کتاب الايمان، باب فضل من استبرأ لدينه]

”جو شخص شبہات سے بچا اس نے اپنا دین اور عزت بچالی۔ اور جو شبہات میں پڑ گیا اس کی مثال اس چرواہے کی ہے جو (شاہی) چراگاہ کے آس پاس (اپنے جانور) چراتا ہے، قریب ہے اس میں جاگھے۔“

مگر بد قسمتی کی بات یہ ہے کہ آج مسلمانوں کی اکثریت دین سے بیگانگی کے باعث

B دورِ حاضر کے مالی معاملات کا شرعی حکم

اسلام کے ان سنہری اصول سے نابلد ہے۔ جو لوگ نماز، روزہ کے پابند ہیں ان میں بھی ایک طبقہ ایسا ہے جس نے دین صرف عبادات، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کا نام سمجھ لیا ہے۔ مالی معاملات کے بارہ میں احکام شرعیہ کو اس طرح نظر انداز کیے ہوئے ہیں کہ گویا ان کا دین کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ بالخصوص جدید معاملات کے متعلق ان کا اندازِ فکر یہ ہے کہ یہ چونکہ دورِ حاضر کی پیداوار ہیں عہد رسالت میں ان کا وجود ہی نہیں تھا اس لیے یہ جائز ہیں۔ ان حالات میں اہل علم پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ معاملاتِ جدیدہ کو سمجھیں اور لوگوں کی صحیح اور کا حق رہنمائی کریں۔

علماء کرام تبریک و تحسین اور قدر افزائی کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس حوالے سے قابلِ قدر کام کیا ہے۔ خصوصاً علمائے عرب نے اس سلسلے میں بہت عمدہ کوششیں کی ہیں۔ جدید مالی معاملات میں سے شاذ و نادر ہی کوئی ایسا مسئلہ ہوگا جس پر عربی زبان میں مستقل کتاب نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ سب کی مساعی حسنہ کو قبول فرمائے اور اس خدمت کو ذریعہ نجات بنائے۔

احقر نے بھی اس ضمن میں ادنیٰ سی کاوش کی ہے جو

دورِ حاضر کے مالی معاملات کا شرعی حکم

کے عنوان سے حاضر خدمت ہے

یاد رہے یہ کتاب اصل میں راقم کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً ہفت روزہ ”الاعتصام“ اور بعض دیگر جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں اب حک و اضافہ کے بعد ان کو کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو حرام اور مشتبہ امور سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔

حافظ ذوالفقار علی

الہدیرہ شریعہ کالج

کریم باغ ملک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

ارشاد باری تعالیٰ

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ۝﴾

[البقرة: ۲۷۹-۲۷۸]

”اے ایمان والو! اللہ سے ڈر جاؤ اور چھوڑ دو باقی سود، اگر تم مومن ہو۔ پھر اگر تم نے یہ نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ اور اگر تم نے توبہ کر لی تو تمہارے لیے تمہارے اصل مال ہیں نہ تم ظلم کرو اور نہ ظلم کیے جاؤ۔“

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ۝﴾ [النساء: ۲۹]

”اے ایمان والو! تم اپنے مال آپس میں باطل طریقے سے نہ کھاؤ مگر یہ کہ تجارت ہو تمہاری باہمی رضامندی سے اور نہ تم قتل کرو اپنے نفسوں کو بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ نہایت رحم کرنے والا ہے۔“





فرموداتِ نبویہ ﷺ

((يَأْتِي عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يُتَالَى الْمَرْءُ مَا أَخَذَ مِنْهُ أَمِنْ الْحَلَالِ أَمْ مِنْ الْحَرَامِ)) [صحيح بخاری: کتاب البیوع، باب من لم یبال من حیث کسب المال]

”لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا جب انسان کو اس کی پروا نہیں رہے گی کہ اس نے جو حاصل کیا ہے وہ حلال ہے یا حرام۔“

((ذُعُ مَا يَرْيُبُكَ إِلَى مَا لَا يَرْيِبُكَ)) [سنن الترمذی: باب ما جاء فی شأن الحساب والقصاص]

”جو چیز تجھے شک میں ڈالے اس کو چھوڑ دے جو شک میں نہ ڈالے اس کو قبول کر لے۔“

((لَا يَحِلُّ سَلَفٌ وَبَيْعٌ وَلَا شَرْطَانٌ فِي بَيْعٍ وَلَا رُبْعٌ مَا لَمْ يُضْمَنْ وَلَا يَبِيعُ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ)) [سنن الترمذی، باب ما جاء فی کراهیة بیع مالیس عنده]

”قرض اور بیع، ایک بیع میں دو شرطیں اور اس چیز کا نفع جس کا رسک برداشت نہ کیا گیا ہو جائز نہیں اور اس چیز کی بیع بھی درست نہیں جو تیرے پاس موجود نہیں۔“



باب اول

اسلام اور جدید مسائل

خصوصیات اسلام:

اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کو جن امتیازی خوبیوں سے نوازا ہے ان میں تین خوبیاں بڑی نمایاں ہیں:

- ۱۔ عالم گیریت۔
 - ۲۔ ابدیت (قیامت تک کے لیے)۔
 - ۳۔ جامعیت اور ہمہ گیریت۔
- (۱) عالم گیریت:

یعنی اسلام کے مخاطب کسی ایک نسل یا خطے کے لوگ نہیں بلکہ یہ ہر دور اور ہر جگہ کے لیے ہے۔

﴿قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ فَأَمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيُّ الَّذِي يَأْتِيكُم بِالْبَيِّنَاتِ وَهُوَ مُبْعَدُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ﴾ [الاعراف: ۱۵۸]

”آپ فرمادیں: لوگو! میں سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں جو آسمانوں اور زمین کی سلطنت کا مالک ہے اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وہی زندہ کرتا اور مارتا ہے، لہٰذا اللہ اور اس کے رسول نبی اُمی پر ایمان لاؤ جو اللہ اور اس کے ارشادات پر ایمان لاتا ہے اور اسی کی پیروی کرو امید ہے تم راہِ راست پا لو گئے۔“

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾ [الانبیاء: ۱۰۷]

”اور ہم نے آپ ﷺ کو تمام دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔“



﴿تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا ۝﴾

[الفرقان: ۱]

”بہت بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر فرقان (قرآن) نازل کیا تاکہ

وہ تمام جہانوں کے لیے (برے انجام سے) ڈرانے والا بن جائے۔“

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝﴾ [السبا: ۲۸]

”اور ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لیے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا مگر

اکثر لوگ نہیں جانتے“

﴿إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ ۝﴾ [التکویر: ۲۷]

”یہ تو سارے جہاں والوں کے لیے نصیحت ہے۔“

نبی ﷺ کی حدیث ہے:

((أُعْطِيتُ خَمْسًا لَمْ يُعْطَهُنَّ أَحَدٌ قَبْلِي نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيرَةَ شَهْرٍ وَجُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِدًا وَطَهُورًا فَأَيُّمَا رَجُلٍ مِنْ أُمَّتِي أَدْرَكْتُهُ الصَّلَاةَ فَلْيُصَلِّ وَأَحِلَّتْ لِيَ الْمَغَائِبُ وَلَمْ تَحِلَّ لِأَحَدٍ قَبْلِي وَأُعْطِيتُ الشَّفَاعَةَ وَكَانَ النَّبِيُّ يُعْتَرِ إِلَى قَوْمِهِ خَاصَّةً وَيُعْتَرِ إِلَى النَّاسِ عَامَّةً)) [صحیح بخاری:

کتاب التسم، باب قول اللہ تعالیٰ فلم تجدوا ماء فتیمموا صعيدا طيبا]

”مجھے پانچ چیزیں دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں دی گئیں۔

۱۔ ایک مہینے کی مسافت کے ساتھ میری مدد کی گئی ہے۔

۲۔ میرے لیے زمین مسجد اور پاک کرنے والی بنا دی گئی ہے، میری امت میں سے

جس آدمی کو جہاں نماز کا وقت پالے وہ نماز پڑھ لے۔

۳۔ میرے لیے غنیمتیں حلال کی گئیں ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کے لیے حلال

نہیں تھیں۔

۴۔ مجھے شفاعت عطا کی گئی ہے۔

۵۔ پہلے انبیاء علیہ السلام خاص قوم کی طرف آتے تھے اور مجھے تمام لوگوں کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہے۔“

(۲) ابدیت:

یعنی اسلامی تعلیمات ایک خاص دور یا مخصوص مدت کے لیے نہیں بلکہ قیامت تک کے لیے ہیں کیونکہ یہ آخری دین اور نبی ﷺ آخری نبی ہیں۔

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِنْ رِجَالِكُمْ وَلَكِنْ رَسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ۝﴾ [الاحزاب: ۴۰]

”محمد (ﷺ) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں بلکہ وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔“

ختم نبوت کا تقاضا یہی ہے کہ اس دین کی تعلیمات ایک مخصوص مدت کے لیے نہ ہوں بلکہ قیامت تک کے لیے ہوں۔

نبی ﷺ کا فرمان ہے:

((نَحْنُ الْأَخِرُونَ السَّابِقُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)) [صحیح بخاری: کتاب الجمعة، باب فرض الجمعة]

”ہم آخری ہیں لیکن قیامت کے دن سب سے آگے ہوں گے۔“

(۳) جامعیت اور ہمہ گیریت:

اس کا مطلب ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے متعلق اسلام نے ہماری رہنمائی نہ کی ہو، اس میں ضروریات زندگی کے تمام مسائل کا حل موجود ہے۔

﴿وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تَبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَى لِلْمُسْلِمِينَ ۝﴾ [النحل: ۸۹]

”اور ہم نے آپ ﷺ پر ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں ہر چیز کی وضاحت موجود ہے اور اس میں مسلمانوں کے لیے ہدایت، رحمت اور خوش خبری ہے۔“

﴿وَلَقَدْ جِئْنَاهُمْ بِكِتَابٍ فَصَّلْنَاهُ عَلَىٰ عِلْمٍ هُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ﴾ [الاعراف: ۵۲]

”ہم ان کے پاس ایسی کتاب لائے ہیں جسے ہم نے علم کی بنا پر مفصل بنا دیا ہے، یہ کتاب ان لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے جو ایمان لاتے ہیں۔“

﴿وَكُلُّ شَيْءٍ فَصَّلْنَاهُ تَفْصِيلًا﴾ [بنی اسرائیل: ۱۲]

”اور ہم نے ہر چیز کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔“

﴿لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُولَى الْأَلْبَابِ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ﴾ [یوسف: ۱۱۱]

”ان قصوں میں اہل عقل و خرد کے لیے (کافی سامان) عبرت ہے، یہ قرآن کوئی ایسی بات نہیں جو گھڑی گئی بلکہ یہ تو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے، اس میں ہر بات کی تفصیل موجود ہے اور ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔“

﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ﴾ میں جس اکمال کا اعلان فرمایا گیا ہے اس کا معنی بھی یہی ہے کہ اس میں انسانی ضرورت اور حلت و حرمت کی تمام باتیں بیان کر دی گئی ہیں۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

((فليست تنزل في أحد من أهل دين الله نازلة إلا وفي كتاب الله

الدليل)) [الرسالة: ج ۱، ص ۲۰]

”کتاب اللہ میں مسلمانوں کو ہر پیش آمدہ مسئلے کے متعلق راہ نمائی موجود ہے۔“

شیخ الحدیث امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

((لا أعلم شيئاً يحتاج إليه إلا وهو في الكتاب والسنة))

”کتاب و سنت میں تمام ضروری مسائل کا حل موجود ہے۔“



پوچھا گیا:

((هل يمكن معرفة ذلك؟ قال نعم)) [مقدمة فتح الباری: ص ۴۸۹]

”کیا اس کی معرفت ممکن ہے؟ کہا ہاں۔“

ثابت ہوا کہ اسلام میں بدلتے ہوئے معروضی حالات اور عصری تقاضے پورے کرنے کی مکمل صلاحیت موجود ہے۔

اسلام اور معیشت و تجارت:

صنعت و تجارت انسانی زندگی کے لازمی اجزاء ہیں، ان کے متعلق اسلام کیوں کر خاموش رہ سکتا تھا۔ قرآن وحدیث میں معاملات کے بارے میں بالکل واضح اور غیر مبہم ہدایات دی گئی ہیں، جو صورتیں معاشرے کے لیے مفید تھیں انہیں باقی رکھا گیا ہے اور جو مضر تھیں وہ سب حرام قرار دی گئیں ہیں:

﴿وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا﴾ [البقرة: ۲۷۵]

”اور اللہ نے بیع کو حلال کیا اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔“

﴿وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتَذَلُّوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ

لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ [البقرة: ۱۸۸]

”اور آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقے سے نہ کھاؤ نہ مقدمات اس غرض سے حکام تک لے جاؤ کہ دوسرے کے مال کا کچھ حصہ ناحق طور پر ہضم کر جاؤ، حالانکہ حقیقت حال تمہیں معلوم ہوتی ہے۔“

مشہور محدث و مفسر ابن العربی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

”یہ آیت معاملات کے قواعد میں سے اور معاوضات کی اساس ہے۔“ [احکام القرآن:

جلد ۱، ص ۱۸۵]

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ

تَكُونُ بِجَارَةٍ عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ

بِكُمْ رَحِيمًا﴾ [النساء: ۲۹]



”اے ایمان والو! تم اپنے مال آپس میں باطل طریقے سے نہ کھاؤ مگر یہ کہ تجارت ہو تمہاری باہمی رضامندی سے اور نہ تم قتل کرو اپنے نفسوں کو بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ نہایت رحم کرنے والا ہے۔“

اس ممانعت میں ناجائز طریقے سے مال حاصل کرنے کے تمام ذرائع شامل ہیں چونکہ اسلامی ہدایات سراسر معاشرے کے مفاد میں ہیں۔ جن کو نظر انداز کرنے سے معاشی بگاڑ پیدا ہونا یقینی امر ہے، اس لیے مسلم معاشرے میں ان لوگوں کو کاروبار کی قطعی اجازت نہیں جو تجارت کے متعلق اسلامی احکام سے ناواقف ہوں، چنانچہ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے۔

((لَا يَبِيعُ فِي سُوقِنَا إِلَّا مَنْ تَفَقَّهَ فِي الدِّينِ)) [جامع ترمذی: ابواب

الوتر، باب ما جاء في فضل الصلاة على النبي]

”ہمارے بازاروں میں وہی خرید و فروخت کرے جسے دین کی سمجھ ہو۔“

یعنی خرید و فروخت کے متعلق دینی احکام سے آگاہ ہو۔ امام ترمذی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس اثر کو حسن قرار دیا ہے۔

بعض شبہات کا ازالہ:

پہلا شبہ: بعض جدت پسندوں کے خیال میں اسلامی ہدایات بلاشبہ تمام نسلوں اور زمانوں کے لیے ہیں مگر ان کا دائرہ عمل صرف عقائد و عبادات تک محدود ہے۔ سیاسی، معاشی اور معاشرتی معاملات میں ہم آزاد ہیں کہ اپنے حالات کے مطابق جس طرح چاہیں فیصلہ کریں، اس نقطہ نظر کی تائید میں ایک روایت بھی توڑ مروڑ کر پیش کی جاتی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

((اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِأَمْرِ دُنْيَاكُمْ)) [صحیح مسلم: کتاب الفضائل، باب وجوب

امتنال مقالہ شرعاً.....]

”تم اپنے دنیوی معاملات کو بہتر جانتے ہو“

جواب:

ہمارے نزدیک اس غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ان مہربانوں نے دیگر مذاہب کی طرح دین اسلام کو بھی محض چند مخصوص عقائد اور خود ساختہ رسومات کا مجموعہ سمجھ لیا ہے حالانکہ اسلام تو ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو دینی معاملات کے ساتھ ساتھ سیاسی، معاشرتی اور معاشی مسائل جیسے تمام معاملات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ دین و دنیا کی جو تفریق عیسائیت میں ہے کہ شخصی زندگی کے ایک محدود گوشے کے سوا باقی ساری اجتماعی اور سیاسی زندگی مذہب کے دائرہ بحث سے خارج ہے اسلام میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔ دین کا ہر طالب علم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے کہ قرآن مجید میں سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل کے بارہ میں بھرپور راہنمائی موجود ہے۔

جن حضرات کو صحیح بخاری کے مطالعہ کا موقع ملا ہے وہ ہمارے موقف کی تائید فرمائیں گے کہ کس طرح امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح بخاری میں عقائد و عبادات، معاشی و معاشرتی مسائل، سیاسی امور، بین الاقوامی تعلقات، حدود و تعزیرات اور دیگر گوشے ہائے زندگی کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث جمع فرمادی ہیں، باقی رہ گئے آپ کے زیر بحث الفاظ تو ان کا ایک خاص محل ہے وہ یہ کہ ہماری زندگی کا وہ دائرہ جسے ہم دنیا سے تعبیر کرتے ہیں اس کے متعلق اسلام نے صرف بنیادی باتیں ذکر کی ہیں اس کے بعد ہمیں آزاد چھوڑ دیا ہے تفصیلات و جزئیات بیان نہیں کیں، البتہ وہ دائرہ جسے دین کہا جاتا ہے اس میں ہم پابند ہیں، اپنی مرضی سے ایک قدم ادھر ادھر نہیں اٹھا سکتے۔

کاروبار کی جو صورت شریعت کی ہدایات یا مقاصد کے خلاف نہ ہو وہ جائز ہے:

اس بات کو علماء رحمۃ اللہ علیہم بیان کرتے ہیں:

”عبادات میں اصل حرمت ہے جب تک شارع کی طرف سے نص نہ ہو کوئی کام کرنا جائز نہیں ہوتا اور معاملات میں اصل اباحت ہے یعنی لین دین کی ہر وہ صورت جائز ہے جس سے شریعت نے منع نہ کیا ہو۔“

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

((وَالْأَصْلُ فِي هَذَا أَنَّهُ لَا يَحْرُمُ عَلَى النَّاسِ مِنَ الْمَعَامَلَاتِ الَّتِي يَحْتَاجُونَ إِلَيْهَا إِلَّا مَادِلَ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ عَلَى تَحْرِيمِهِ كَمَا لَا يَشْرَعُ لَهُمْ مِنَ الْعِبَادَاتِ الَّتِي يَتَقَرَّبُونَ بِهَا إِلَى اللَّهِ إِلَّا مَادِلَ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ (على شرعه)) [مجموع الفتاوى لابن تيمية: ج ٢٨ ص ٣٨٦]

”اس بارہ میں اصل یہ ہے کہ وہ معاملات جن کی لوگوں کو ضرورت ہوتی ہے ان میں سے صرف وہی حرام ہیں جن کی حرمت پر کتاب و سنت دلالت کر رہی ہوں جیسا کہ عبادات میں سے وہی جائز ہیں جن کی مشروعیت پر قرآن و حدیث میں رہنمائی موجود ہو۔“

زیر بحث حدیث کے علاوہ ذیل کی احادیث سے بھی اس اصول کی تائید ہوتی ہے:

((الْمُسْلِمُونَ عِنْدَ شُرُوطِهِمْ)) [بخاری: کتاب الاجارہ، باب اجر السمسرة]

”مسلمان اپنی شرطوں کے مطابق ہیں۔“

دوسرے مقام پر آپ ﷺ ارشاد ہے:

((الْمُسْلِمُونَ عَلَى شُرُوطِهِمْ إِلَّا شَرْطًا حَرَّمَ حَلَالًا أَوْ أَحَلَّ حَرَامًا)) [جامع ترمذی: کتاب الاحکام، باب ما ذکر عن رسول الله في الصلح بين الناس]

”مسلمان اپنی شرطوں پر ہیں مگر وہ شرط جو حرام کو حلال یا حلال کو حرام قرار دے“

عبادات کے متعلق آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

((صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي)) [صحیح بخاری: کتاب الاذان، باب

الاذان للمسافر اذا كانوا جماعة.....]

”نماز پڑھو! جس طرح مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو۔“

متذکرہ بالا احادیث کے علاوہ ذیل کی آیات بھی اس کی تائید کرتی ہیں:



﴿قُلْ أَرَأَيْتُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ لَكُمْ مِنْ رِزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِنْهُ حَرَامًا

وَحَلَالًا قُلِ اللَّهُ أَذِنَ لَكُمْ أَمْ عَلَى اللَّهِ تَفْتَرُونَ﴾ [يونس: ۵۹]

”آپ ﷺ ان سے کہیں کیا تم نے سوچا کہ اللہ نے تمہارے لیے جو رزق اتارا تھا اس میں سے تم نے خود ہی کسی کو کو حرام قرار دے لیا اور کسی کو حلال، تو کیا اللہ نے تم کو اس کی اجازت دی ہے یا تم اللہ پر جھوٹ باندھتے ہو؟“

﴿إِنَّ اللَّهَ الَّذِي سَخَّرَ لَكُمْ الْبَحْرَ لَتَجْرِيَ الْفُلُكُ فِيهِ بِأَمْرِهِ

وَلِتَسْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي

السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِنْهُ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ

يَتَفَكَّرُونَ﴾ [الحاثیة: ۱۲۰، ۱۳]

”اللہ ہی ہے جس نے سمندر کو تمہارے تابع کر دیا تاکہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں چلیں اور تم اس کا فضل تلاش کرو اور اس کے شکر گزار بنو اور جو کچھ آسمانوں میں یا زمین میں ہے سب کچھ تمہارے لیے کام پر لگا رکھا ہے غور و فکر کرنے والوں کے لیے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔“

سورۃ یونس کی مذکورہ بالا آیت ان لوگوں کے متعلق نازل ہوئی ہیں جنہوں نے اپنے

آباؤ اجداد کی عادات اور عرف کی بنیاد پر بعض چیزوں کو حرام قرار دے رکھا تھا۔

﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَذَا حَلَالٌ وَهَذَا حَرَامٌ

لِتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا

يُفْلِحُونَ﴾ [النحل: ۱۱۶]

”جو جھوٹ تمہاری زبانوں پر آجائے اس کی بنا پر یوں نہ کہا کرو کہ یہ چیزیں حلال ہیں اور یہ حرام ہیں تاکہ تم اللہ پر جھوٹ باندھنے لگو اور جو اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ کبھی فلاح نہیں پاتے۔“

اس آیت میں خواہشات نفس سے مباح اشیاء کو حرام قرار دینے کی ممانعت ہے:



﴿وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرَرْتُمْ إِلَيْهِ ۝﴾

[الانعام: ۱۱۹]

”جو کچھ اس نے تم پر حرام کیا ہے اسے تمہارے لیے تفصیلاً بیان کر دیا گیا ہے الا یہ کہ تم (کوئی حرام چیز کھانے پر) مجبور ہو جاؤ۔“
امام ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((فَكُلُّ مَا لَمْ يُفَصَّلْ لَنَا تَحْرِيمُهُ فَهُوَ حَلَالٌ بِنَصِّ الْقُرْآنِ، إِذْ لَيْسَ فِي الدِّينِ إِلَّا فَرَضٌ أَوْ حَرَامٌ أَوْ حَلَالٌ، فَالْفَرَضُ مَا مُوَرِّدُهُ فِي الْقُرْآنِ وَالسُّنَّةِ، وَالْحَرَامُ مُفَصَّلٌ بِاسْمِهِ فِي الْقُرْآنِ وَالسُّنَّةِ، وَمَا عَدَا هَذَيْنِ فَلَيْسَ فَرَضًا وَلَا حَرَامًا فَهُوَ بِالضَّرُورَةِ حَلَالٌ)) [المحلى بآثار لابن

حزم: ج ۱ ص ۳۵۷]

”ہر وہ چیز جس کی حرمت بیان نہیں ہوئی وہ اس قرآنی نص کے مطابق حلال ہے، کیونکہ دین میں یا تو فرض ہیں یا حلال یا حرام، جو فرض ہیں قرآن و سنت میں نام لے کر ان کا حکم دیا گیا ہے جو حرام ہیں ان کی تفصیل بھی موجود ہے ان دونوں کے علاوہ جو نہ فرض ہیں نہ حرام وہ بدابھتا حلال ہیں۔“

دوسرا شبہ:

بعض حضرات یہ سوال بھی اٹھاتے ہیں کہ:

”بہت سے ایسے معاملات ہیں جو دور حاضر میں معاشرتی زندگی کا لازمی حصہ بن چکے ہیں لیکن عہد رسالت میں ان کا ذکر تک نہیں ملتا اور نہ کتب حدیث و فقہ میں ان کا کوئی تذکرہ ہے پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اسلام میں ضرورت زندگی کے ہر مسئلہ کا حل موجود ہے۔؟“

ہماری رائے میں یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ معاملات میں اصل اباحت ہے یہ سوال بالکل بے معنی ہے کیونکہ اس اصول کے مطابق لین دین کی ہر وہ صورت جائز ہوگی جس سے



شریعت نے منع نہ کیا ہو۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھیے اس کا یہ معنی ہرگز نہیں کہ جس چیز کا نام لے کر اسلام نے منع نہ کیا ہو وہ جائز ہے بلکہ اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ لین دین کی ہر وہ شکل جو اسلام کے بیان کردہ اصول اور مقاصد شریعت کے خلاف نہ ہو وہ جائز ہے۔

ہمارے خیال میں کوئی ایسا نیا مسئلہ موجود نہیں جو انسانی زندگی کے لیے ضروری ہو لیکن قرآن و حدیث کی اصولی ہدایات، مقاصد شریعت اور فقہی قواعد کی روشنی میں اس کا حل ممکن نہ ہو! عہد رسالت کے بعد پیدا ہونے والے مسائل کے متعلق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تابعین عظام، محدثین فقہاء اور علمائے اسلام رضی اللہ عنہم کے فتاویٰ اس کا واضح ثبوت ہیں۔

خلاصہ

❁ قرآن و حدیث کی اصولی ہدایات اور مقاصد شریعت کی روشنی میں ہر مسئلہ کا حل ممکن ہے۔



مالی معاملات کے بنیادی اصول

شریعت نے جن مالی معاملات کو ممنوع قرار دیا ہے اگر گہری نظر سے ان کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ چیزیں جو شرعاً قابل انتفاع ہوں انسان کی ملکیت اور قبضہ میں ہوں دو اصولوں کی پابندی کے ساتھ ان کا دوسرے کے ساتھ معاملہ کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ معاملہ ربا (سود) سے پاک ہو۔

۲۔ غرر (Uncertainty) سے مبرا ہو۔

بشرطیکہ اس میں ممانعت کی کوئی خارجی وجہ یا ایک عقد میں دو عقد یا ایسی شرط جو مقتضی عقد کے خلاف ہو یا ایک عقد میں دو شرطیں نہ پائی جا رہی ہوں۔

علاوہ ازیں خرید و فروخت اور قرض کا معاملہ بھی جمع نہیں ہو سکتے یعنی قرض دینے کی شرط پر چیز خریدنا یا قرض دینے کے بدلے خریدنے کی شرط لگانا جائز نہیں۔

شراب، مردار، خنزیر اور بتوں کی تجارت حرام ہے کیونکہ یہ چیزیں شرعاً قابل انتفاع نہیں۔ بیع پر بیع منع ہے کہ ان میں ممانعت کی خارجی وجہ پائی جاتی ہے۔ فی نفسہ بیع میں کوئی خرابی نہیں۔

چنانچہ علامہ ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ ممنوعہ بیوع کا تذکرہ کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

((ولا تخرج عن ثلاثة اقسام؛ وهي الربا والباطل والغرر ويرجع

الغرر بالتحقيق الى الباطل فيكون قسمين على الآيتين)) [احکام

القرآن: ج ۱ ص ۲۶۴]

”یہ سب تین قسموں میں شامل ہے اور وہ تین قسمیں یہ ہیں: (۱) سود۔ (۲) باطل

طریقے سے مال کمانا۔ (۳) غرر۔ حقیقت میں غرر بھی باطل طریقے سے مال کمانے

میں شامل ہے یوں دو آیتوں کے مطابق دو قسمیں ہی بنتی ہیں۔“
 فقہائے اہل سنت نے بیع کے جو ضوابط بیان فرمائے ہیں ان کی بنیاد یہی اصول
 ہیں۔ ذیل میں اختصار کے ساتھ سود اور غرر کے متعلق ضروری باتیں بیان کی جاتی ہیں۔
 ربا (سود):

سرمایہ دارانہ نظام میں تجارت اور ربا کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ سرمایہ دار کے نزدیک
 اقتصادی سرگرمیوں کے لیے ربا ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اسلام جس طرح کا
 عادلانہ اور منصفانہ معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے وہ ربا کی موجودگی میں ممکن نہیں، خواہ وہ ذاتی
 قرضوں پر لیا جائے یا تجارتی قرضوں پر۔ کیونکہ ربا سے جو ذہنیت پرورش پاتی ہے وہ قدم
 بہ قدم اسلام سے ٹکراتی ہے۔ یہ معاشرے کے مختلف طبقات میں عداوت کا باعث
 بنتا ہے۔ غریبوں پر صریح ظلم اور لوگوں کا مال باطل طریقے سے کھانے کی قبیح ترین شکل
 ہے۔ اس لیے اسلام نے اس کو حرام قرار دیا ہے اور اسے کبیرہ گناہوں میں شمار کیا ہے اللہ
 تعالیٰ نے اس کے مرتکب کے ساتھ اعلان جنگ فرمایا ہے، لہذا الین دین کی ہر وہ صورت
 ناجائز ہے جس میں ربا کا عنصر پایا جائے۔

ذیل میں ربا کے متعلق قرآن کی بعض آیات اور نبی ﷺ کی احادیث ملاحظہ ہوں۔

﴿الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ
 الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ذَلِكِ بَأْنَهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا
 وَأَحْلَلَتِ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّهِ
 فَاتْنَهَى فَلَهُ مَا سَلَفَ وَأَمْرُهُ إِلَى اللَّهِ وَمَنْ عَادَ فَأُولَئِكَ
 أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُزِيلُ
 الصَّدَقَاتِ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ ۝﴾ [البقرة: ۲۷۶، ۲۷۷]

”جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ یوں کھڑے ہوں گے جیسے شیطان نے کسی شخص کو چھو کر
 مضبوط الحواس بنادیا ہو۔ اس کی وجہ ان کا یہ قول ہے کہ تجارت بھی تو آخر سود کی طرح

ہے، حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام، اب جس شخص کو اس کے رب کی طرف سے یہ نصیحت پہنچ گئی اور وہ سود سے رک جائے تو پہلے جو سود کھا چکا اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے مگر جو پھر بھی سود کھائے تو یہی لوگ دوزخی ہیں، جس میں ہمیشہ رہیں گئے اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کی پرورش کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کسی ناشکرے بندے کو پسند نہیں کرتا۔“

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ [آل عمران: ۱۳۰]

”اے ایمان والو! سود کو دگنا چوگنا کر کے مت کھاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ تم آخرت میں نجات پا سکو۔“

((اجْتَنِبُوا السَّبْعَ الْمُوبِقَاتِ قَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ وَمَا هُنَّ قَالَ الشَّرْكُ بِاللَّهِ وَالسَّخَرُ وَقَتْلُ النَّفْسِ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَأَكْلُ الرِّبَا وَأَكْلُ مَالِ الْيَتِيمِ وَالتَّوَلَّى يَوْمَ الزَّحْفِ وَقَذْفُ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ الْغَافِلَاتِ)) [صحیح بخاری: کتاب الوصایا، باب قول اللہ تعالیٰ ان الذین یاکلون الخ]

”سات مہلک گناہوں سے بچو صحابہ نے پوچھا اللہ کے نبی وہ کون سے گناہ ہیں؟ آپ نے فرمایا: اللہ کے ساتھ شریک کرنا، جادو کرنا، جس نفس کو اللہ نے حرام کیا ہے اس کو ناحق قتل کرنا، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، جنگ کے دن پیٹھ دکھا کر بھاگنا، پاک دامن اور بنو بھالی عورتوں پر تہمت لگانا“

((قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَرَهُمْ رَبًّا يَأْكُلُهُ الرَّجُلُ وَهُوَ يَعْلَمُ أَشَدُّ مِنْ سِتَّةٍ وَثَلَاثِينَ زَنِيَةً)) [مسند احمد: ۲۰۹۵۱]

”ربا کا ایک درہم جو انسان علم ہونے کے باوجود کھاتا ہے ۳۶ (چھتیس) زناؤں سے زیادہ سخت ہے۔“

((الربا ثلاثة وسبعون بابا ، أيسرها مثل أن ينكح الرجل أمه))

[مستدرک حاکم: کتاب البیوع]

”سود کے ستر دروازے ہیں سب سے ہلکا یہ ہے کہ انسان اپنی ماں کے ساتھ نکاح کرے“

اس لیے نبی ﷺ نے اس میں ملوث تمام لوگوں کو لعنتی قرار دیا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

((لَعَنَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَكِلَ الرِّبَا وَمُؤْكِلَهُ وَكَاتِبَهُ وَشَاهِدِيَهُ وَقَالَ هُمْ سَوَاءٌ)) [صحیح مسلم: کتاب المساقاة، باب لعن أكل الربا وموكله]

”نبی کریم ﷺ نے سود کھانے، سود کھلانے، لکھنے والے اور اس کے گواہوں پر لعنت فرمائی ہے اور فرمایا یہ سب گناہ میں برابر کے شریک ہیں۔“

سود کی حرمت پر اجماع ہے:

علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

((كل قرض شرط فيه ان يزيد فلهو حرام بغير خلاف))

[المغنی: ج ۹: ص ۱۰۴]

”ہر وہ قرض جس میں اضافے کی شرط ہو وہ بلا اختلاف حرام ہے“

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وقد اتفق العلماء على ان المقرض متى اشترط زيادة على

قرضه كان ذلك حرام)) [مجموع الفتاوی: ج ۲۹ ص ۳۳۴]

”سب علماء اس بات پر متفق ہیں کہ قرض دینے والا جب اپنے قرض پر اضافے کی

شرط لگائے تو یہ حرام ہوگا۔“

علامہ ماوردی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

((اجمع المسلمون على تحريم الربا وعلى انه من الكبائر))

[عمدة القاری: ج ۱ ص ۲۰۰]

”سود کی حرمت اور اس کے کبیرہ گناہ ہونے پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔“
ربا ایک وسیع الذیل موضوع ہے۔ یہاں اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ ممکن نہیں اس لیے ہم صرف اس کی تعریف اور قسمیں ذکر کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔
ربا کا معنی و مفہوم:

عربی لغت میں ربا کا معنی ہے:

((الفضل، الزيادة، النماء))

”زائد، زیادتی اور نمو“

اصطلاح میں ربا کا لفظ دو معنوں کے لیے آتا ہے:

۱۔ قرض یا دین کی اصل رقم پر جو زائد رقم بطور شرط یا معاہدہ لی جائے یا ایک جنس کی دو چیزوں کا اس طرح تبادلہ کیا جائے کہ دونوں یا ایک طرف سے ادھار ہو۔ اس کو ربا النسیئة کہا جاتا ہے۔

۲۔ ایک طرح کی دو چیزوں کا کمی بیشی سے تبادلہ یہ ربا الفضل کہلاتا ہے۔

علامہ ڈاکٹر عمر بن عبدالعزیز المکترک رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

((وهناك من العلماء من يرى ان الربا اسم يقع على كل البيوع

المحرمة)) [الربا والمعاملات المصرفية في نظر الشريعة

الاسلامية: ص ۴۴]

”بعض علماء کے خیال میں ربا کا اطلاق تمام حرام بیوع پر ہوتا ہے“

قرآن کی روشنی میں ربا الفضل کا حکم:

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

((فَإِنَّهُ يَتَنَاوَلُ كُلَّ مَا نَهَى عَنْهُ مِنْ رَبِّهَا النَّسَاءِ وَرَبِّهَا الْفُضْلِ وَالْقَرْضِ
الَّذِي يَجْرُ مُنْفَعَةً وَغَيْرَ ذَلِكَ))

”ربا کا لفظ ربانسیہ، ربا الفضل اور جو قرض نفع کا باعث بنے سب کو شامل ہے۔“

احادیث میں ربا الفضل کا حکم:

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا:
((يُنَهَى عَنْ بَيْعِ الذَّهَبِ بِالذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ بِالْفِضَّةِ وَالْبُرِّ بِالْبُرِّ
وَالشَّعِيرِ بِالشَّعِيرِ وَالتَّمْرِ بِالتَّمْرِ وَالْمِلْحِ بِالْمِلْحِ إِلَّا سَوَاءً بِسَوَاءٍ
عَيْنًا بَعِيْنٍ فَمَنْ زَادَ أَوْ أُرْدَادَ فَقَدْ أُرْبَى فَرَدَّ النَّاسُ مَا أَخَذُوا))
[صحیح مسلم: کتاب المساقات، باب الصرف وبيع الذهب
بالورق نقدا]

”آپ صلی اللہ علیہ وسلم سونے کی سونے کے ساتھ، چاندی کی چاندی کے ساتھ گندم کی گندم
کے ساتھ جو کی جو کے ساتھ کھجور کی کھجور کے ساتھ اور نمک کی نمک کے ساتھ بیع سے منع
فرماتے تھے الا یہ کہ برابر برابر اور نقد ہوں جو زیادہ یا زیادہ دے وہ ربا کا مرتکب
ہو اتو لوگوں نے جولیا تھا وہ لوٹا دیا۔“

ظاہر ہے دو ایک طرح کی چیزوں کے تبادلے کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب
ان کی جنس ایک ہونے کے باوجود کوالٹی میں فرق ہو اس صورت میں اسلام نے ہمارے
سامنے دو ہی راستے رکھے ہیں۔

۱۔ جو کم تر چیز کے بدلے اعلیٰ یا اعلیٰ کے بدلے کم تر لینا چاہتا ہے وہ پہلے اس چیز کو بازار
میں فروخت کرے اس کے بعد اپنی مطلوبہ چیز خریدے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے:

((أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اسْتَعْمَلَ رَجُلًا عَلَى خَيْبَرٍ
فَعَجَّاهُ بِتَمْرٍ خَبِيبٍ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَكُلْتُ تَمْرٍ
خَبِيرَ هَكَذَا قَالَ لَا وَاللَّهِ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّا لَنَأْخُذُ الصَّاعَ مِنْ هَذَا

بِالصَّاعَيْنِ وَالصَّاعَيْنِ بِالثَّلَاثَةِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَفْعَلْ بَعْ الْحَمْعَ بِالذَّرَاهِمِ ثُمَّ اتَّبَعَ بِالذَّرَاهِمِ جَنِيْبًا))

[صحیح بخاری: کتاب البیوع، باب اذا اراد بيع تمر بتمر خیر منه]
 ”نبی ﷺ نے خیبر پر ایک آدمی کو عامل مقرر کیا وہ آپ ﷺ کے پاس بہترین کھجوریں لے کر آیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا خیبر کی تمام کھجوریں اس قسم کی ہیں؟ اس نے جواب دیا: اے اللہ کے رسول ﷺ واللہ ایسی نہیں ہیں ہم دو صاع کے بدلے اس کا ایک صاع اور تین صاع کے بدلے اس کے دو صاع وصول کرتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا ایسا نہ کرو ان ردی کھجوروں کو نقد درہموں سے پیچو پھر ان درہموں سے اعلیٰ کھجوریں خریدو اور یہی ہدایت وزن کی جانے والی اشیاء کے متعلق فرمائی۔“

۲۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو دوسری صورت یہ ہے کہ دونوں اشیاء کے مابین خاصیت کے فرق (Quality) کو نظر انداز کر دیا جائے۔

ربا الفضل کیوں حرام ہے؟

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کوالٹی میں فرق کی بنیاد پر کمی بیشی کے ساتھ تبادلے میں بظاہر کوئی خرابی نظر نہیں آتی کیونکہ اعلیٰ درجے اور کم تر درجے کی چیز برابر نہیں پھر شریعت نے اسے کیوں حرام قرار دیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے انسان میں سود خوری کی ذہنیت پرورش پانے کا اندیشہ تھا۔ دین اسلام کا یہ طرہ امتیاز ہے کہ جب وہ کسی چیز کو حرام قرار دیتا ہے تو اس تک پہنچنے کے تمام راستے اور ذرائع بھی بند کر دیتا ہے چنانچہ نبی ﷺ نے اس کی یہ حکمت: وہی بیان فرمادی ہے۔

((لَا تَبِيعُوا الدِّينَارَ بِالدِّينَارِ وَلَا الدِّرْهَمَ بِالدِّرْهَمِ وَلَا الصَّاعَ بِالصَّاعِ فَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمُ الرَّمَاءَ وَالرَّمَاءُ هُوَ الرِّبَا))

[مسند احمد: ۶۰۲۵]

”ایک درہم کو دوسرے درہم اور ایک صاع کو دو صاع کے عوض نہ پیچو کیونکہ مجھے خوف ہے کہ

کہیں تم سود خوری میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔“

بظاہر یکساں چیزوں کا تبادلہ:

ایسی اشیاء جو بظاہر یکساں ہوں ان کے باہمی تبادلہ کی تین صورتیں ممکن ہیں:

- ۱۔ دونوں کی جنس ایک ہو۔
 - ۲۔ جنس اور صنف مختلف ہو۔
 - ۳۔ جنس ایک ہو، مگر صنف مختلف ہو۔
- پہلی صورت میں کمی بیشی منع ہے اور ادھار بھی، دوسری صورت میں کمی بیشی اور ادھار دونوں جائز ہیں، تیسری صورت میں کمی بیشی جائز ہے مگر ادھار درست نہیں۔
- ربا الفضل کا دائرہ:

ربا الفضل کی ممانعت کی احادیث میں صرف چھ مخصوص چیزوں کا ذکر ہے۔

- | | | |
|----------|-----------|----------|
| (۱) سونا | (۲) چاندی | (۳) گندم |
| (۴) جو | (۵) کھجور | (۶) نمک |

بعض روایات میں خشک انگور (منقہ) کا ذکر بھی ہے کیا یہ ممانعت صرف انہی چیزوں کے ساتھ خاص ہے یا ان کے علاوہ باقی اشیاء بھی اس میں شامل ہیں؟ اس کے متعلق فقہاء رحمہم اللہ کا اختلاف ہے۔

ہماری رائے میں سونے، چاندی میں علت قیمت ہے اور باقی چیزوں میں قابل غذا و ذخیرہ ہونا۔ جہاں یہ علت پائی جائے گی وہاں دو ایک طرح کی چیزوں کا تبادلہ کمی بیشی کے ساتھ ناجائز ہوگا البتہ حدیث میں جانوروں کے متعلق رخصت آئی ہے کہ ایک جانور کی جگہ دو لینا درست ہے۔

اسی طرح سونا خام شکل میں ہو اور دوسری طرف زیور ہو تو ایسی صورت میں بھی کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ ہو سکتا ہے، کیونکہ زیور پر اضافی محنت خرچ ہوتی ہے لہذا اس کا اضافی معاوضہ لینا جائز ہے۔

کیا ربا کی حقیقت واضح نہیں؟

بعض حلقوں کی جانب سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قرآن وحدیث میں ربا کی کوئی جامع مانع تعریف بیان نہیں ہوئی اس لیے کسی چیز کو ربا قرار دینا ہماری اپنی صواب دید پر منحصر ہے ان حضرات کی طرف سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فرمان کا حوالہ بھی دیا جاتا ہے:

((إِنْ آخِرَ مَا نَزَلَتْ آيَةُ الرَّبَا وَإِنْ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قُبِضَ وَلَمْ يُفَسِّرْهَا لَنَا فَدَعُوا الرَّبَا وَالرَّيْبَةَ)) [سنن ابن ماجہ: کتاب

التحارات ، باب التغليظ فی الربا]

”سب سے آخری آیت جو نازل ہوئی وہ ربا کی آیت ہے اللہ کے نبی ﷺ فوت ہو گئے اور اس کی تفسیر بیان نہ کر سکے لہذا تم ربا بھی چھوڑ دو اور شک والی چیزیں بھی۔“ لیکن درج ذیل وجوہ کے باعث ان حضرات کا استدلال انتہائی کمزور ہے۔

۱۔ قرآن کا اسلوب عام فنی کتب سے بالکل مختلف ہے اس میں کسی چیز کی بھی فقہی اور قانونی تعریف بیان نہیں ہوئی، قرآن نے زنا کو فتنہ ترین جرم قرار دیا ہے، شراب اور جوئے کو حرام قرار دیا ہے لیکن ان میں سے کسی کی بھی تعریف بیان نہیں فرمائی، کیا اس استدلال کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ قرآن نے ان گناہوں کی تعریف ذکر نہیں کی، لہذا ان کا مفہوم متعین کرنا ہماری صواب دید پر منحصر ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ قرآن میں ان گناہوں کی تعریف اس لیے بیان نہیں ہوئی کہ یہ سب چیزیں اتنی واضح تھیں کہ بطور خاص ان کی تعریف کی ضرورت ہی نہ تھی، قرآن کے مخاطبین ان کی حقیقت سے پوری طرح واقف تھے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے ربا کے مرتکب لوگوں کے خلاف اعلان جنگ کیا ہے۔ کیا یہ تصور کیا جاسکتا کہ اللہ نے مبہم غیر متعین عمل جس کی حقیقت ہی معلوم نہ ہو کے ارتکاب پر اعلان جنگ فرمادیا ہو؟

﴿لَا يَكْلَفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ [البقرة: ۲۸۶]



”اللہ تعالیٰ کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔“

۳۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فرمان کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ربا کی حرمت آپ کی زندگی کے آخری ایام میں نازل ہوئی تھی۔ اس کی حرمت تو اس سے کافی عرصہ پہلے نازل ہو چکی تھی، غالباً غزوہ احد کے فوراً بعد:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ [آل عمران: ۱۳۰]

”اے ایمان والو! سود کو دگنا چو گنا کر کے مت کھاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم آخرت میں نجات پا سکو۔“

اس آیت میں صریحاً ربا کی ممانعت کا حکم ہے یہ آیت غزوہ احد کے فوراً بعد نازل ہوئی تھی بلکہ بعض روایات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ربا غزوہ احد سے پہلے ہی ممنوع قرار دیا جا چکا تھا۔ مثلاً حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

((قَدِمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ نَتَّبِعُ هَذَا الْبَيْعَ، فَقَالَ مَا كَانَ يَدًا بِيَدٍ فَلَيْسَ بِهِ بَأْسٌ، وَمَا كَانَ نَسِيبَةً فَلَا يَصْلُحُ))

[صحیح بخاری: کتاب المناقب، باب کیف آخی النبی بین اصحابہ]
”نبی ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے اور ہم یہ بیع کرتے تھے (ایک مخصوص بیع کی طرف اشارہ ہے) تو آپ ﷺ نے فرمایا: جو نقد بہ نقد ہو اس میں کوئی حرج نہیں اور جو ادھار ہو وہ درست نہیں۔“

((عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْوَلِيدِ كَانَ لَهُ رِبَا فِي الْجَاهِلِيَّةِ فَكَرَهُ أَنْ يُسْلِمَ حَتَّى يَأْخُذَهُ فَجَاءَ يَوْمَ أُحُدٍ فَقَالَ أَيْنَ بَنُو عُمَيٍّ قَالُوا بِأُحُدٍ قَالَ أَيْنَ فَلَانٌ قَالُوا بِأُحُدٍ قَالَ أَيْنَ فَلَانٌ قَالُوا بِأُحُدٍ فَلَيْسَ لَأَمْتِهِ وَرَكِبَ فَرَسَهُ ثُمَّ تَوَجَّهَ قِبَلَهُمْ فَلَمَّا رَأَاهُ الْمُسْلِمُونَ قَالُوا: إِلَيْكَ عَنَّا يَا عُمَرُ قَالَ إِنِّي قَدْ آمَنْتُ)) [ابوداؤد: باب فِيمَنْ يُسْلِمُ وَيُقْتَلُ مَكَانَهُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ]

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عمرو بن ایتیش رضی اللہ عنہ کا زمانہ جاہلیت میں کسی کے ذمہ سود تھا انہوں نے اس کی وصولی تک اسلام قبول کرنے کو ناپسند سمجھا، وہ جنگ احد کے دن آئے اور پوچھا میرے چچا زاد کہاں ہیں؟ جواب ملا: جنگ احد میں، پوچھا فلاں کہاں ہے؟ جواب دیا گیا: احد میں، انہوں نے پوچھا فلاں کہاں ہے؟ کہاں گیا: احد میں انہوں نے اسلحہ پہنا اور گھوڑے پر سوار ہو کر احد کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب مسلمانوں نے انہیں دیکھا تو کہنے لگے: اے عمرو! پیچھے ہٹ جاؤ، اس پر انہوں نے کہا: میں اسلام لا چکا ہوں۔“

۴۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فرمان سے ربا کا جواز ثابت کرنا ان کے مقصود کے صریح خلاف ہے کیونکہ ان کا مقصود یہ ہے کہ صرف صریح ربا ہی سے نہ بچو بلکہ ہر اس معاملے سے بچو جس میں ربا کا شائبہ بھی ہو اس سے ربا کا جواز نکالنا انتہائی درجے کی کم عقلی ہے۔

صحیحین، سنن ابی داؤد، نسائی، ترمذی اور موطا میں حرمت ربا کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی بعض روایات ملاحظہ فرمائیں:

((الذَّهَبُ بِالدَّهَبِ رَبًّا إِلَّا هَاءَ وَهَاءَ وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ رَبًّا إِلَّا هَاءَ وَهَاءَ وَالتَّمْرُ بِالتَّمْرِ رَبًّا إِلَّا هَاءَ وَهَاءَ وَالشَّعِيرُ بِالشَّعِيرِ رَبًّا إِلَّا هَاءَ وَهَاءَ))

[بخاری: کتاب البيوع، باب ما يذكر في بيع الطعام والحكرة]

”سونا سونے کے عوض، گندم گندم کے بدلے، کھجور کھجور کے اور جو جو کے بدلے سود ہے سوائے اس کے کہ برابر برابر اور نقد لین دین ہو۔“

((عَنْ مَالِكِ بْنِ أَوْسٍ بْنِ الْحَدَثَانِ النَّصْرِيِّ أَنَّهُ التَّمَسَّ صَرَفًا بِمِائَةِ دِينَارٍ قَالَ فَدَعَانِي طَلْحَةُ بْنُ عُبَيْدٍ اللَّهُ فَنَرَاوَضَنَا حَتَّى اصْطَرَفَ مِنِّي وَأَخَذَ الذَّهَبَ يُقْلِبُهَا فِي يَدَيْهِ ثُمَّ قَالَ حَتَّى يَأْتِيَنِي خَازِنِي مِنَ الْغَابَةِ . وَعُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ يَسْمَعُ . فَقَالَ عُمَرُ وَاللَّهِ لَا تَفَارِقُهُ حَتَّى

تَأْخُذُ مِنْهُ ثُمَّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الذَّهَبُ
بِالْوَرِقِ رِبًا إِلَّا هَاءَ وَهَاءَ وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ رِبًا إِلَّا هَاءَ وَهَاءَ وَالنَّمْرُ
بِالنَّمْرِ رِبًا إِلَّا هَاءَ وَهَاءَ وَالشَّعِيرُ بِالشَّعِيرِ رِبًا إِلَّا هَاءَ وَهَاءَ))
[موطا امام مالک، باب ماجاء فی الصرف، صحیح بخاری: باب بیع

الشعیر بالشعیر]

”مالک بن اوس بن حدثان نصری سے روایت ہے کہ انہوں نے سودینار بھنانا چاہے
کہتے ہیں مجھے طلحہ بن عبید اللہ نے بلایا، ہم متفق ہو گئے یہاں تک کہ انہوں نے مجھ
سے بیع صرف کر لی اور وہ دینار پکڑ کر اپنے ہاتھ میں اچھالنے لگے، پھر کہا غابہ سے
میرے غزا پنچی کے آنے تک انتظار کرو۔ اور عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما یہ بات سن رہے تھے۔
انہوں نے کہا جب تک اس سے وصول نہ کر لو اس سے جدا نہ ہونا، پھر عمر رضی اللہ عنہما نے کہا
کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے سونا چاندی کے بدلے سود ہے مگر یہ کہ نقد بقصد ہو،
گندم گندم کے بدلے سود ہے مگر یہ کہ برابر اور نقد ہو۔ کھجور کھجور کے بدلے سود ہے مگر
یہ کہ برابر اور نقد ہو، جو کے بدلے سود ہے الا کہ برابر اور نقد ہوں۔“

ان دونوں روایتوں سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو ربہ کی حرمت اور حقیقت
کے متعلق کوئی اشتباہ نہ تھا۔ ان کا اصل شبہ یہ تھا کہ آیا اس کا دائرہ صرف انہی چیزوں تک
محدود ہے جن کا حدیث میں ذکر ہے یا ان کے علاوہ دوسری چیزیں بھی اس میں شامل ہیں
؟ اس کی تائید صحیح بخاری کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے۔

((ثَلَاثٌ وَدِدْتُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يُفَارِقْنَا
حَتَّى يَعْهَدَ إِلَيْنَا عَهْدًا الْحَدُّ وَالْكَلَالَةُ وَأَبْوَابُ مِنَ أَبْوَابِ الرِّبَا))
[صحیح بخاری: کتاب الاشربة، باب ماجاء فی ان الخمر ما خامر العقل]

”تین چیزیں ایسی ہیں جن کے متعلق میری خواہش تھی کہ نبی ﷺ ان کی تفصیل بیان
کرنے سے قبل ہم سے جدا نہ ہوتے۔ (۱) دادا کی وراثت کا مسئلہ (۲) کلالہ کی وراثت کا

مسئلہ (۳) ربا کے بعض مسائل۔

غَرَرُ (uncertainty):

دوسرا اصول یہ ہے کہ معاملہ غرر سے مبرا ہو۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

((النَّهْيُ عَنْ بَيْعِ الْغَرَرِ فَهُوَ أَصْلُ عَظِيمٍ مِنْ أَصُولِ كِتَابِ الْبَيْعِ))

[شرح نووی علی مسلم: کتاب البیوع، باب بطلان بیع الحصة.....]

”بیع غرر سے ممانعت کتاب البیوع کے اصول میں سے ایک عظیم اصول ہے۔“

اس اصول کی بنیاد وہ آیات ہیں جن میں باطل طریقے سے مال کھانے کی ممانعت ہے
علامہ ابن العربی رحمہ اللہ باطل کی تشریح میں فرماتے ہیں:

”اس میں وہ تمام بیوع شامل ہیں جو شرعاً حلال نہیں اور مقصود کے لیے مفید نہیں ہیں

کیونکہ شریعت نے ان سے منع کیا ہے اور ان کے لین دین کو حرام قرار دیا ہے جیسے سود،

غرر وغیرہ ہیں۔“ [احکام القرآن: ج ۱ ص ۱۱۱]

غرر کے متعلق ذیل کی احادیث ملاحظہ فرمائیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

((نَهَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعِ الْحَصَاةِ وَعَنْ بَيْعِ

الْغَرَرِ)) [صحیح مسلم: کتاب البیوع، باب بطلان بیع الحصة]

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکری کی بیع اور بیع غرر سے منع فرمایا۔“

سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ تابعی کہتے ہیں:

((أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى عَنْ بَيْعِ الْغَرَرِ))

[موطا امام مالک: کتاب البیوع، باب بیع الغرر]

”بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع غرر سے منع فرمایا۔“

آخری روایت مرسل ہے جو سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ تابعی براہ راست نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل



کر رہے ہیں جمہور کے نزدیک ایسی روایت کو دلیل بنانا درست نہیں لیکن چونکہ اوپر کی دو روایتیں اس کی تائید کر رہی ہیں اس لیے ہم نے اس کو بھی یہاں بیان کر دیا ہے۔
غرر کا معنی:

مذکورہ بالا روایات میں معاملے کے غرر سے پاک ہونے کو بطور ایک اصول کے بیان کیا گیا ہے احادیث میں جن بیوع کے نام لے کر منع کیا گیا ہے ان میں سے بیشتر کی وجہ غرر ہی ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لغت اور علمائے حدیث وفقہ کے حوالے سے غرر کی حقیقت بھی واضح کر دی جائے۔

لغت میں غرر کا معنی دھوکہ دینا، غلط امید دلانا ہے:

ابن اثیر رحمہ اللہ غرر کی تعریف یوں کرتے ہیں:

((هُوَ مَا كَانَ لَهُ ظَاهِرٌ يُغَرُّ الْمُشْتَرِيَّ وَبَاطِنٌ مَجْهُولٌ))

[النهاية: ج ۳ ص ۶۶۱]

”جس کا ظاہر مشتری کو دھوکہ دے اور باطن مجہول ہو۔“

المعجم الوسيط میں ہے:

((بيع الغرر بيع ما يحمله المتبايعان او مالا يتوثق بتسلمه))

”وہ بیع جس سے دونوں بیع کرنے والے ناواقف ہوں یا اس کے حوالے کرنے کا

یقین نہ ہو، بیع غرر ہے۔“

ازہری رحمہ اللہ کہتے ہیں:

”بیع غرر میں وہ تمام بیوع داخل ہیں جن کی حقیقت سے بیع کرنے والے

ناواقف ہوں۔“ [لسان العرب]

علامہ عینی رحمہ اللہ ابن عرفہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

((الغرر هو ما كان ظاهره يغرو باطنه مجهول)) [عمدة القاری

شرح صحيح بخاری: ج ۱۷ ص ۴۷۱]

”جس کا ظاہر دھوکے میں مبتلا کرے مگر اس کا باطن مجہول ہو۔“

نیز صاحب مشارق کے حوالے سے لکھتے ہیں:

”بیع غرر مخاطره کو کہتے ہیں بیع مخاطره وہ ہے جس میں قیمت یا چیز یا اس کا سلامت ہونا یا اس کی مدت واضح نہ ہو۔“

نامور محدث امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

((كل بيع كان المقصود منه مجهولا غير معلوم ومعجوزا عنه غير مقدور عليه فهو غرر وذلك مثل ان يبيعه سمكا في الماء او طيرا في الهواء لؤلؤا في البحر او عبدا ابقا او جملا شاردا او ثوبا في جراب لم يره ولم ينشره او طعاما في بيت لم يفتحه او ولد بهيمة لم تولد او ثمر شجرة لم تنمرو في نحوها من الامور التي لا تعلم ولا يدري هل تكون ام لا فان البيع فيها مفسوخ وانما نهى صلى الله عليه وسلم عن هذه البيوع تحصينا للاموال ان تضع وقطعا للخصومة والنزاع ان يقعا بين الناس فيها وابواب الغرر كثيرة وجماعها ما دخل في المقصود منه (الجهل)) [معالم السنن: ج ۳ ص ۶۷۲]

”ہر وہ بیع جس میں مقصود مجہول، نامعلوم اور دائرہ قدرت سے باہر ہے وہ غرر ہے اس کی مثال پانی میں مچھلی، ہوا میں پرندے سمندر میں لؤلؤ، بھاگے ہوئے غلام، پھرے ہوئے اونٹ، تھیلی میں بند کپڑے، جنہیں دیکھا نہ گیا ہو یا مقفل کمرے میں غلہ، جانور کا ایسا بچہ جو ابھی پیدا نہ ہوا ہو، درخت کے ایسے پھل جو ابھی وجود میں نہ آئے ہوں اور اس طرح کی دوسری چیزیں جو نامعلوم ہوتی ہیں اور جن کے متعلق یہ علم نہیں ہوتا کہ ہوں گی یا نہیں تو اس کی خرید و فروخت منع ہے۔ نبی ﷺ نے ایسی خرید و فروخت سے منع فرمایا ہے تاکہ لوگوں کے مال ضائع ہونے سے محفوظ رہیں اور لوگوں کے درمیان جھگڑا پیدا نہ ہو۔ غرر کے ابواب بہت زیادہ ہیں اور ان کے لب لباب یہ ہے کہ جہاں مقصود میں جہالت آجائے وہ غرر ہے۔“

امام نووی رحمہ اللہ رقم طراز ہیں:

((وَيَذْخُلُ فِيهِ مَسَائِلُ كَثِيرَةٌ غَيْرُ مُنْهَصَرَةٍ كَبَيْعِ الْأَبِقِ وَالْمَعْدُومِ
وَالْمَجْهُولِ وَمَا لَا يَقْدِرُ عَلَى تَسْلِيمِهِ وَمَا لَمْ يَتِمَّ مِلْكُ الْبَائِعِ عَلَيْهِ
وَبَيْعِ السَّمَكِ فِي الْمَاءِ الْكَثِيرِ وَاللَّبَنِ فِي الضَّرْعِ وَبَيْعِ الْحَمَلِ فِي
الْبَطْنِ وَبَيْعِ بَعْضِ الصُّبْرَةِ مُبْهَمًا وَبَيْعِ نَوْبٍ مِنْ أُنُوبٍ وَشَاةٍ مِنْ
شِيَاهِ وَنَظَائِرِ ذَلِكَ، وَكُلٌّ هَذَا بَيْعُهُ بَاطِلٌ لِأَنَّهُ غَرَرٌ مِنْ غَيْرِ حَاجَةٍ))

[شرح نووی علی مسلم: کتاب البیوع، باب بطلان بیع الحصة]

”اس بیعِ غرر میں بہت سے مسائل داخل ہیں جیسے بھاگے ہوئے غلام، معدوم و مجہول اور اس کی فروخت جس کے حوالے کر سکنے کی قدرت نہ ہو اور جس پر بیچنے والے کی ملکیت نہ ہو کثیر پانی میں مچھلی، جانور کے تھنوں میں دودھ، حمل، ڈھیر کے کچھ حصہ کی، مبہم کپڑوں میں سے کسی ایک کپڑے اور بکریوں میں سے کسی ایک بکری کی اور اس طرح کی دیگر چیزوں کی فروخت تو یہ سب باطل ہیں کیونکہ یہ ایسا غرر ہے جس کی ضرورت نہیں۔“

مزید لکھتے ہیں:

((وَأَعْلَمُ أَنَّ بَيْعَ الْمَلَامَسَةِ وَبَيْعَ الْمُنَابَذَةِ وَبَيْعَ حَبْلِ الْحَبْلَةِ وَبَيْعِ
الْحَصَاةِ وَعَسْبِ الْفُحْلِ وَأَشْبَاهِهَا مِنَ الْبُيُوعِ الَّتِي جَاءَ فِيهَا نُصُوصُ
خَاصَّةٌ هِيَ دَاخِلَةٌ فِي النَّهْيِ عَنْ بَيْعِ الْغَرَرِ وَلَكِنْ أَفْرَدْتُ بِالذِّكْرِ،
وَنَهَيْتُ عَنْهَا لِكَوْنِهَا مِنْ بَيَاعَاتِ الْجَاهِلِيَّةِ الْمَشْهُورَةِ وَاللَّهِ أَعْلَمُ))

[شرح نووی علی مسلم: کتاب البیوع، باب بطلان بیع الحصة]

”جان لو! بیعِ ملامسہ، منابذہ، حمل الحبل، بیعِ حصاة، عسبِ محل اور اس طرح کی دوسری بیع جن کے متعلق خاص نصوص وارد ہیں وہ بیعِ غرر کی ممانعت میں داخل ہیں لیکن اس کا الگ ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ یہ جاہلیت کی مشہور بیوع میں سے ہیں۔“

شارح بخاری علامہ ابن بطلال کہتے ہیں:

((وقد ذكرنا ان الغرر هو ما يجوز ان يوجد وان لا يوجد))

[شرح بخاری ابن بطلال: ج ۱۱ ص ۲۸۲]

”ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ غرر وہ ہے جس کے ہونے اور نہ ہونے دونوں کا احتمال ہو۔“
حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ غرر کی تشریح میں لکھتے ہیں:

((وهذا كبيع العبد الا بقى الذی لا يقدر علی تسليمه والفرس الشارد والطير فی الهواء..... ونحو ذلك مما لا يعلم حصوله او لا يقدر علی تسليمه او لا يعرف حقيقته ومقداره ومنه بيع جبل الحبلة..... ومنه

بيع الملامسة والمنابرة)) (زاد المعاد، بيع الغرر: ج ۵ ص ۷۲۵)
”اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس چیز کو حوالے نہ کیا جاسکتا ہو یا جس کی حقیقت اور مقدار معلوم نہ ہو وہ بیع غرر میں شامل ہے۔ بیع جبل الحبلة، ملامسة، منابرة اسی نوعیت کی ہے۔“
امام الہند شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

((وهو الذی يتيقن انه موجود او لا)) [حجة البالغة: ج ۲ ص ۱۹۴]
”جس کے ہونے یا نہ ہونے کا یقین نہ ہو“

شارح ترمذی علامہ مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ غرر کی تشریح میں رقم طراز ہیں:

((مَا لَا يُعْلَمُ عَاقِبَتُهُ مِنَ الْخَطَرِ الَّذِي لَا يُدْرَى أَيُّكُونُ أَمْ لَا كَبَيْعِ الْإِبِقِ وَالطَّيْرِ فِي الْهَوَاءِ وَالسَّمَكِ فِي الْمَاءِ، وَالْعَائِبِ الْمَجْهُولِ وَمُجْمَلُهُ أَنْ يَكُونَ الْمَعْقُودُ عَلَيْهِ مَجْهُولًا أَوْ مَعْجُوزًا عَنْهُ)) [تحفة الاحوذی:

ابواب البيوع، باب ما جاء في كراهية بيع الغرر]

”اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مقصود مجہول یا حوالے نہ کیا جاسکتا ہو تو وہ غرر ہے۔“

مذکورہ بالا تفصیل سے تین باتیں واضح ہوتی ہیں:

۱۔ پہلی بات تو یہ ثابت ہوتی ہے کہ لغت میں علمائے حدیث و فقہ کے ہاں غرر کا لفظ بڑا

وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ ایک حدیث میں پانی میں جھلی کی بیج کو بھی غرر قرار دیا گیا ہے۔

((لا تشتروا السمك في الماء فانه غرر)) [مسند احمد]

۲۔ دوسری بات یہ ثابت ہوتی ہے کہ جو چیز مشتری کے حوالے نہ کی جاسکتی ہو یا اس میں جہالت پائی جائے تو اس کا کسی سے بیع کا معاملہ کرنا جائز نہیں۔ خواہ جہالت خود چیز یا اس کی جنس، نوع، صنف، مقدار، قیمت یا اجل میں پائی جائے یا عقد کے الفاظ میں۔ بیع کی ذیل کی اقسام اسی قبیل سے ہیں:

❁ بیعتین فی بیعة: یعنی فروخت کرنے والا یہ کہے: ”یہ چیز نقد سو کی اور ادھار ایک سو دس کی بشرطیکہ کسی ایک قیمت کا تعین نہ ہو۔“

❁ بیع الحصاة: یہ کہنا کہ: ”میں یہ کنکری پھینکتا ہوں یہ جس کپڑے پر لگے میں وہ آپ کو اتنے کا فروخت کرتا ہوں یا یہ کہنا کہ یہ کنکری یہاں سے جہاں تک جائے وہ زمین اتنی قیمت میں فروخت کرتا ہوں۔“

❁ بیع ملامسة: صرف خریدار کے چیز کو ہاتھ لگانے سے بیع مکمل ہو جائے دیکھنے کی اجازت نہ ہو۔

❁ بیع منابذة: فریقین میں سے ہر ایک اپنی اپنی چیز پھینکے اور یہ پھینکنا ہی فروخت قرار پائے۔

❁ بیع معلق: جس میں ملکیت کا ثبوت کسی ایسے واقعہ سے جوڑا گیا ہو جس کے ہونے اور نہ ہونے دونوں کا احتمال ہو۔ قمار، لائری، اور انشورنس اسی قبیل سے ہیں۔

۳۔ اس تفصیل سے تیسری بات یہ ثابت ہوتی ہے کہ جہالت کی تمام اقسام غرر میں شامل ہیں البتہ بعض علماء جہالت کو غرر سے الگ بھی قرار دیتے ہیں۔

غرر کا دائرہ:

حدیث اور فقہاء کے کلام میں جہاں غرر کی ممانعت آئی ہے وہ اگرچہ بیع کے متعلق ہے لیکن فقہاء نے دوسرے مالی معاملات (از قسم معاوضات) کو بھی اس پر قیاس کر کے ان کے



غرر سے پاک ہونے کی شرط لگائی ہے۔

مشکوک معاملات سے بھی پرہیز ضروری ہے:

مزید برآں ان معاملات سے بھی بچنے کا حکم ہے جو شریعت کے ایک اصول کی روشنی میں تو جائز مگر کسی دوسرے اصول کی روشنی میں ناجائز ہوتے ہیں۔ اس موضوع کی بعض احادیث ملاحظہ ہوں۔

✽ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا:

((الْحَلَالُ بَيْنَ وَالْحَرَامِ بَيْنٌ، وَبَيْنَهُمَا مُشَبَّهَاتٌ لَا يَعْلَمُهَا كَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ، فَمَنِ اتَّقَى الْمُشَبَّهَاتِ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ وَعِرْضِهِ، وَمَنْ وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ كَرَّاعٍ يَرَعَى حَوْلَ الْحِمَى، يُوشِكُ أَنْ يُوَاقِعَهُ))

[صحیح بخاری: کتاب الایمان، باب فضل من استبرأ لدينه]

”حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے اور ان کے درمیان کچھ مشتبہ امور ہیں جن کو اکثر لوگ نہیں جانتے۔ جو شخص شبہات سے بچا اس نے اپنا دین اور عزت بچا لی۔ اور جو شبہات میں پڑ گیا اس کی مثال اس چرواہے کی ہے جو (شاہی) چراگاہ کے آس پاس (اپنے جانور) چراتا ہے، قریب ہے اس میں جاگھسے۔“

✽ حضرت عطیہ سعدی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا يَبْلُغُ الْعَبْدُ أَنْ يَكُونَ مِنَ الْمُتَّقِينَ حَتَّى يَدَّعَ مَا لَا بَأْسَ بِهِ حَدَرًا لِّمَا بِهِ الْبَأْسُ)) [سنن ترمذی باب لا يبلغ العبد أن]

”بندہ اس وقت تک پرہیزگار نہیں بن سکتا جب تک حرج والی چیزوں کے خوف سے وہ چیزیں بھی نہ چھوڑ دے جن میں کوئی حرج نہیں“

یہ دونوں احادیث اس امر کا واضح ثبوت ہیں کہ صریح حرام کے علاوہ مشتبہ معاملات سے بھی اجتناب کرنا چاہیے کیونکہ اس طرح حرام میں مبتلا ہونے کا اندیشہ نہیں رہتا۔ اور یہی تقوی کا تقاضا ہے۔

خلاصہ

- ❁ جو چیز قابل انتفاع یا انسان کی ملکیت و قبضہ میں نہ ہو اس کی خرید و فروخت نہیں ہو سکتی۔
- ❁ خرید و فروخت کی جس صورت میں سود اور غرر کی آمیزش ہو یا ایک عقد میں دو عقد جمع ہو رہے ہوں یا شرط فاسد یا دو شرطیں پائی جا رہی ہوں وہ جائز نہیں۔
- ❁ تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ مشتبہ معاملات سے بھی بچا جائے۔



مروجہ معاملات کی تفصیل

جب ہم پیچھے بیان کردہ اصول کی روشنی میں دور حاضر کے مالی معاملات کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کے جواز یا عدم جواز میں کوئی اشتباہ باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ ذیل میں ہم بعض معاملات کا ذکر کرتے ہیں۔

کریڈٹ کارڈ:

ان میں سرفہرست کریڈٹ کارڈ کا استعمال ہے جو عصر حاضر میں ایسی کرنسی کا روپ دھار چکا ہے جو پوری دنیا میں یکساں طور پر استعمال ہو سکتی ہے۔

کریڈٹ کارڈ کی حقیقت:

کریڈٹ کارڈ کو عربی میں ”بطاقة الائتمان“ کہا جاتا ہے۔ جس کا لغوی معنی ہے ”اعتبار، اعتماد اور قرض کا کارڈ“ جدید معاشی ماہرین کی اصطلاح میں اس سے مراد وہ مخصوص کارڈ ہے جو کسی مالیاتی ادارے کی جانب سے جاری کیا جاتا ہے۔ جس پر کسٹمر کا نام، تاریخ اجراء و اختتام اور کارڈ کا نمبر وغیرہ لکھا ہوتا ہے۔ اور یہ ایسے سائز اور میٹریل کا ہوتا ہے جو آسانی سے جیب میں رکھا جاسکتا ہے۔ اس کا حامل خریداری کے مخصوص مراکز پر یہ کارڈ دکھا کر اپنی ضرورت کی اشیاء خرید سکتا ہے۔ جن کا بل خریداری کرنے والے کی بجائے کارڈ جاری کرنے والا ادارہ کرتا ہے۔ جو بعد میں اس سے وصول یا اس کے اکاؤنٹ سے منہا کر لیا جاتا ہے۔ اگر صارف معینہ مدت کے اندر ادائیگی نہ کر سکے تو اس پر سود وصول کیا جاتا ہے۔ جس کا تعین واجب الاداء رقم کے حساب سے کیا جاتا ہے اور اس کی شرح وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔ واضح رہے کہ صارف سے وصولی کی مدت عموماً ایک ماہ سے زیادہ تو ہو سکتی ہے لیکن کم نہیں۔



کریڈٹ کارڈ کی تاریخ:

بیسویں صدی کا آغاز کریڈٹ کارڈ کا ابتدائی دور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے کریڈٹ کارڈ کا استعمال ۱۹۱۴ء میں امریکہ میں کیا گیا جو مختلف برانچز (Branches) رکھنے والے ہوٹل اور تیل کمپنیوں نے اپنے گاہکوں کو استعمال کے لیے دیا۔ [البطاقات الدائنية للدكتور محمد بن سعود العصيمي: ص ۲۶]

لیکن اس کا زیادہ استعمال دوسری جنگ عظیم کے بعد اس وقت بڑھا جب مختلف مالیاتی اداروں نے اس کو جاری کرنا شروع کیا۔

۱۹۴۷ء میں The Flat Bus National Band پہلا بینک ہے جس نے یہ کارڈ جاری کیا۔ ۱۹۵۱ء میں Dinners Clib نے پہلا عالم گیر سطح کا کارڈ جاری کیا جو نیویارک میں ہوٹلوں اور دوسرے کاروباری مقامات پر یکساں استعمال ہونے لگا اس کے بعد امریکن ایکسپریس اور Blannch Carte کارڈ سامنے آیا۔ [الخدمات المصرفية للدكتور علاء الدين الزعتری: ص ۵۶۹، ۵۵۹]

۱۹۵۸ء میں بینک آف امریکا نے کیلفورنیا میں Bank Americarad کے نام تبدیل کر کے Viza Card رکھ دیا گیا اور اس کے تحت جاری ہونے والے کارڈ کو ویزا کہا جانے لگا جو اس وقت سب سے مشہور کارڈ شمار ہوتا ہے۔ اس کے بعد جو کارڈ زیادہ تیزی سے پھیلا وہ ماسٹر کارڈ ہے ان کے علاوہ دیگر کارڈ بھی زیر گردش ہیں مگر زیادہ معروف اور زیر استعمال یہی دو ہیں اسلامی ممالک میں اس کا استعمال بیسویں صدی کے آخر میں یعنی ۱۹۹۰ء کے بعد شروع ہوا۔ اس کی بڑھتی ہوئی مانگ کو دیکھتے ہوئے چھوٹے بینک بڑے بینکوں سے تعلقات استوار کرنے لگے تاکہ اس کے استعمال کو وسعت دی جاسکے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس میں سود کا عنصر ۱۹۷۰ء میں داخل کیا گیا۔ اس سے پہلے صرف سروس چارجز (Serviec Chrges) کے نام پر سالانہ فیس وصول کی جاتی تھی۔



کارڈز کی مختلف قسمیں:

مختلف مالیاتی ادارے اور کمپنیاں اپنے صارفین کی سہولت کے لیے جو کارڈز جاری کرتیں ہیں مختلف اعتبار سے ان کی مختلف قسمیں ہیں لیکن بنیادی قسمیں دو ہی ہیں۔

۱۔ سودی

۲۔ غیر سودی

(۱) سودی:

جن پر تاخیر کی صورت میں جرمانہ عائد ہوتا ہے عام کریڈٹ کارڈ اور چارج کارڈ اسی قسم سے ہیں۔ چارج کارڈ کو عربی میں ”بطاقة الائتمان العادية“ یا ”بطاقة الخصم الشهري“ کہا جاتا ہے اس میں اور کریڈٹ کارڈ میں فرق ہے وہ یہ کہ چارج کارڈ میں مقررہ مدت کے اندر مکمل ادائیگی ضروری ہوتی ہے۔ قسط کی سہولت نہیں ہوتی تاخیر کی صورت میں جرمانہ وصول کرنے کے علاوہ کارڈ بھی منسوخ کر دیا جاتا ہے جبکہ کریڈٹ کارڈ میں پوری رقم یک مشت واپس کرنا ضروری نہیں ہوتی قسط کی سہولت بھی ہوتی ہے تاہم اس پر سود ادا کرنا ہوتا ہے۔

(۲) غیر سودی:

اس سے مراد "Debit Card" ہے یہ کارڈ صرف اس کو جاری کیا جاتا ہے جس کا اس بینک میں جس سے کارڈ لیا جا رہا ہے بیلنس موجود ہو۔ جب اس کارڈ کے ذریعے خریداری کی جاتی ہے تو اس کے اکاؤنٹ سے اتنی رقم از خود متعلقہ تاجر کے کھاتے میں منتقل ہو جاتی ہے۔ یعنی اس کارڈ کا حامل اصل میں اپنی رقم ہی استعمال کرتا ہے بینک صرف اس پر سروس چارجز (Service Charges) وصول کرتا ہے۔ ڈیبٹ کارڈ کا حامل اپنے بیلنس سے زائد خریداری نہیں کر سکتا الا کہ بینک کی طرف سے پیشگی اجازت ہو۔ یہ کارڈ عموماً ملک کے اندر ہی استعمال ہوتا ہے۔ اس میں ادائیگی میں تاخیر اور جرمانہ کا اندیشہ نہیں ہوتا۔

کارڈز کے فوائد:

کارڈز میں تین فریق ہوتے ہیں:

- ۱۔ مالیاتی ادارہ یا بینک جو کارڈ جاری کرتا ہے
 - ۲۔ خریداری کے وہ مراکز جہاں کارڈ قبول کیے جاتے ہیں۔
 - ۳۔ کارڈ ہولڈر
- کارڈ کے استعمال سے تینوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔

بینک کو حاصل ہونے والے فوائد:

- ❁ جائگ فیس: بینکوں کے درمیان سخت مسابقت اور مقابلے کی وجہ سے بعض بینک یہ فیس وصول نہیں کرتے اور مفت کریڈٹ کارڈ فراہم کرتے ہیں۔
- ❁ سالانہ فیس: جسے بینک کی طرف سے Service Charges کا نام دیا جاتا ہے۔
- ❁ تاجر سے وصول ہونے والا کمیشن۔
- ❁ کارڈ گم یا چوری ہو جائے تو نیا کارڈ جاری کروانے کی فیس۔
- ❁ ادائیگی میں تاخیر کی بنا پر کارڈ ہولڈر سے وصول کی جانے والی اضافی رقم۔

تاجر کا فائدہ:

- ❁ تجارت کا فروغ: کیونکہ کارڈ ہولڈر خریداری کے لیے انہی مراکز کا رخ کرتے ہیں جو کارڈ قبول کرتے ہیں۔
- ❁ رقم کی وصولی کا اطمینان۔

کارڈ ہولڈر کو پہنچنے والے فوائد:

- ❁ رقم جیب میں لے کر گھومنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس طرح رقم چوری ہونے یا ضائع ہونے کا خطرہ نہیں ہوتا، کارڈ گم یا چوری ہونے کی صورت میں بینک کو اطلاع کر دی جائے تو کوئی دوسرا استعمال نہیں کر سکتا۔



❁ ادائیگی میں آسانی: ایک ماہ سے لے کر ڈیڑھ ماہ تک مہلت مل جاتی ہے۔
 ❁ اگر کارڈ کے ذریعے سفری ٹکٹ خریدا گیا ہو تو حادثے کی صورت میں انشورنس (Insurance) کی سہولت۔

کارڈز کے نقصانات:

کارڈز کے کچھ نقصانات بھی ہیں جو صرف کارڈ ہولڈر کے حصہ میں آتے ہیں۔
 ❁ اکثر لوگ بغیر سوچے سمجھے ایسی چیزیں خرید لیتے ہیں جن کی فوری ضرورت نہیں ہوتی ہے اور نہ ہی آئندہ کچھ عرصہ کے لیے خریدنے کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ اس طرح بچت کی عادت ختم ہو جاتی ہے اور لوگ قرض تلے دب جاتے ہیں چنانچہ مجموعی طور پر معیشت پر اس کے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق امریکی اور یورپی عوام میں شاید ہی کوئی ایسا شہری ہو جس نے بینکوں کی قسطیں ادا نہ کرنی ہوں۔ کریڈٹ کارڈ نے ان ترقی یافتہ اقوام کو مقروض اقوام میں بدل دیا ہے۔
 ❁ حامل کارڈ کی خاصی رقم فیس کی نذر ہو جاتی ہے۔ پاکستان میں ”سٹینڈرڈ چارٹرڈ بینک“ نے ”گولڈن ماسٹر کریڈٹ کارڈ“ کی سالانہ فیس ۴۰۰۰ روپے رکھی ہے۔
 ❁ اصل میں یہ ایک سودی معاہدہ ہوتا ہے۔ جس میں شامل ہونا ایک مسلمان کے لیے جائز نہیں۔
 ❁ جن مراکز سے کریڈٹ کارڈ کے ذریعے خریداری کی جاتی ہے وہ عموماً دوسرے کاروباری مراکز سے مہنگے ہوتے ہیں۔

کریڈٹ اور چارج کارڈز کا شرعی حکم:

اگر کریڈٹ اور چارج کارڈز کی حقیقت پر غور کیا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ یہ دونوں درحقیقت قرض کے کارڈز ہیں، کریڈٹ کارڈ میں طویل مدت کا قرض ہے جبکہ چارج کارڈ مختصر مدت کا۔ چونکہ ان میں تاخیر پر جرمانہ وصول کیا جاتا ہے جو زمانہ جاہلیت کے ”سود“ اِما ان تقفی و اِما ان تربی کے مشابہ ہے۔ جس سے قرآن نے سختی سے روکا ہے۔



لہذا ان کا استعمال شرعاً جائز نہیں ہے۔

علامہ مکر بن عبد اللہ ابو زید رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

((ان بطاقة الائتمان بوضعها العام المعروف عالمياً والمحتوية على شروط ومواصفات قطعية التحريم، مثل: غرامات التأخير والحسم الذي يقتضيه البنك..... المصدر لها..... من فاتورة التاجر الموقعة من العميل، وتوفير قدر من المنافع لحاملها كالتخفيض، والخدمات الأخرى، هذه ((البطاقة الائتمانية)) محرماً شرعاً)) [بطاقة الائتمان : ص ۵۶]

”بلاشبہ وہ کریڈٹ کارڈ جو عام صورت میں عالمی سطح پر معروف ہے اور جو قطعی حرام شروط اور صفات پر مشتمل ہوتا ہے مثلاً ادائیگی کی تاخیر پر جرمانہ اور وہ کوئی جو کارڈ جاری کرنے والا بینک تاجر کے بل جس پر کارڈ ہولڈر کے دستخط ہوتے ہیں سے کرتا ہے اور وہ فوائد جو حامل کو ملتے ہیں جیسے ڈسکاؤنٹ وغیرہ یہ کارڈ شرعی طور پر حرام ہے۔“

بعض علماء کی رائے میں اگر یہ اطمینان کر لیا جائے کہ مقررہ مدت میں ادائیگی کر دی جائے گی تو اس کے استعمال میں کوئی خرابی نہیں۔ لیکن بعض دوسرے علماء کے خیال میں یہ سودی معاہدہ ہے جس کا حصہ بننا جائز نہیں۔

ڈیبٹ کارڈ (Debit Card) کا استعمال جائز ہے:

ڈیبٹ کارڈ کو عربی میں ”بطاقة الحسم الفوری“ کہا جاتا ہے۔ اس میں چونکہ کارڈ ہولڈر اپنا بیلنس ہی استعمال کرتا ہے اس وجہ سے جرمانے کا اندیشہ نہیں ہوتا لہذا اس کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں۔

چنانچہ علامہ مکر بن عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

((ان كل بطاقة لها غطاء كامل من مال حاملها فلا تسمح بالسحب الفوری، ولا التحويل الآلى الا على حسابه، ورصيده لدى



مصدرها، فہمی بهذا الوصف جاریۃ علی الاصل الشرعی: الحل
(والجواز) [بطاقة الائتمان: ص ۵۵]

”ہر وہ کارڈ جس کے پیچھے کارڈ ہولڈر کی رقم بینک میں موجود ہو وہ جب بھی رقم نکالے یا
خرچ کرے وہ اس کے اپنے کھاتے ہی سے ہو تو یہ شرعی اصول (معاملات میں اصل
جواز ہے) کے مطابق جائز ہے۔“

بعض علماء کے نزدیک جب کوئی شخص ڈیٹ کارڈ کے ذریعے خریداری کرتا ہے تو وہ
ڈکاندار کو بینک کے حوالے کرتا ہے کہ آپ یہ بل مجھ سے وصول کرنے کی بجائے بینک
سے وصول پالیں۔ اصطلاح میں اس کو حوالہ کہا جاتا ہے جو جائز ہے۔ نبی ﷺ کا ارشاد
گرامی ہے:

((اذا اتبع احدکم علی ملی فلیتبع)) [صحیح البخاری کتاب الحوالۃ]

”جب تم میں سے کسی کو مالدار کے حوالہ کیا جائے تو وہ حوالے ہو جائے“

تاہم بینک کا تاجر سے کمیشن لینا محل نظر ہے۔ کیونکہ بظاہر یہ ڈسکاؤنٹ بل آف ایکسیج
کے مشابہ ہے کیونکہ بینک تاجر کو کوٹتی کے بعد ادائیگی کرتا ہے یعنی کارڈ ہولڈر سے زیادہ
وصول کرتا ہے مگر تاجر کو کم ادا کرتا ہے یہی سود ہے۔ بعض حضرات اس کمیشن کو دلالی کی اجرت
قرار دیتے ہیں لیکن یہ درست نہیں۔ کیونکہ دلالی کا تصور اس سے مختلف ہے۔ دلال کسٹمر کو
قائل کرتا ہے بینک یہ کام نہیں کرتا۔

انشورنس (التامین):

عصر حاضر میں جو معاملات کثرت سے رائج ہیں ان میں انشورنس بھی ہے جو انسانی
معاشرے کو اس طرح اپنی پلیٹ میں لے چکی ہے کہ بعض دفعہ انسان نہ چاہتے ہوئے بھی
قانوناً اس پر مجبور ہو جاتا ہے۔

انشورنس کی ابتدا:

انشورنس اگرچہ اپنی سادہ شکل میں صدیوں سے رائج ہے لیکن اس نے ایک مضبوط



نظام کی صورت انیسویں صدی عیسوی میں اختیار کی۔ اس کے بعد بیسویں صدی اس کی ترقی کا دور ہے جس میں اس کی مروجہ صورتیں سامنے آئیں، ذیل میں ہم اس کے ارتقائی دور کا مختصر خاکہ بیان کرتے ہیں۔

✽ کہا جاتا ہے کہ اس کا ابتدائی تصور بارہویں صدی عیسوی کے آخر میں Bottomry (بحری جہاز پر قرض کا عقد) کے نام سے سامنے آیا، جس کی صورت یہ تھی کہ تاجر کشتی کے مالک کو بحری سفر پر آمادہ کرنے کے لیے اتنا قرض دیتا جو کشتی اور اس پر موجود سامان کی قیمت کے برابر ہوتا۔ اگر کشتی بندرگاہ پر باحفاظت پہنچنے میں کامیاب ہو جاتی تو کشتی کا مالک وہ رقم اضافے کے ساتھ واپس کرتا لیکن اگر سمندر میں غرق ہو جاتی تو تاجر کا قرض ضائع ہو جاتا۔

✽ بحری انشورنس کی پہلی باقاعدہ دستاویز ۱۲۳۷ء میں اٹلی میں لکھی گئی۔ چودھویں صدی عیسوی کے آخر میں جب اٹلی اور بحر روم کے ساحلی ممالک کے درمیان تجارت کو فروغ ملا تو انشورنس میں بھی وسعت پیدا ہوئی۔

✽ بری انشورنس کی ابتدا سترھویں صدی عیسوی میں لندن سے ہوئی۔ جس کا پس منظر یہ ہے کہ ۱۶۶۶ء میں لندن میں ایک خوف ناک آگ بھڑک اٹھی، جس سے تیرہ ہزار سے زائد مکانات، سو کے قریب گر جا گھر، بہت سی دکانیں اور فیکٹریاں جل کر راکھ ہو گئیں۔ مستقبل میں ناگہانی نقصانات سے بچنے کی سوچ نے لوگوں کو انشورنس کی راہ دکھائی، وہ یہودی سا ہو کار جو اٹلی سے نکلنے کے بعد لندن کو اپنا مرکز بنائے ہوئے تھے انہوں نے اس واقعے کو غنیمت جانا اور لوگوں کو آتش زدگی سے بچانے والے نقصان کا ازالہ کرنے کے لیے انشورنس کی ترغیبات دینا شروع کیں اس طرح اس کی متعدد صورتیں سامنے آئیں۔

✽ اٹھارویں صدی عیسوی میں انشورنس کا کاروبار پورے یورپ اور امریکی ریاستوں میں پھیل چکا تھا۔



✽ انیسویں صدی صنعتی ترقی کا دور ہے، اس میں انشورنس کی ایک نئی قسم ”تھرڈ پارٹی انشورنس“ (تامین ضد المسئولية) سامنے آئی۔

✽ اس کے بعد Mutual (التأمين التبادلي) اور گڈ ز انشورنس متعارف ہوئیں۔

✽ انیسویں صدی کا آخر لائف انشورنس (تامین الحیاة) کے متعارف ہونے کا زمانہ ہے۔

✽ اسلامی ممالک انیسویں صدی میں یورپی تاجروں کے توسط سے اس سے آشنا ہوئے، شام کے فقیہ علامہ ابن عابدین شامی پہلے عالم ہیں جنہوں نے ”سوکرہ“ کے نام سے اس کا ذکر کیا۔

✽ بعض مفکرین اس کا ابتدائی دور ۹۱۶ ق م بیان کرتے ہیں، جب روڈس (جزیرہ یونان) میں بحری تاجروں کے نقصان کی تقسیم کا نظام وضع کیا گیا۔

✽ بعض مفکرین کی رائے میں اس فکر کا بانی رومن ایپائیر ہے، جس نے اپنی بحری فوجی قوت کو مضبوط کرنے کے لیے اسلحے کے تاجروں سے یہ وعدہ کیا کہ نقصان کی صورت میں حکومت تلافی کرے گی لیکن یہ درست نہیں، کیونکہ اس صورت میں تاجر سے کچھ وصول نہیں کیا جاتا، حکومت کی طرف سے جو کچھ دیا جاتا تھا وہ ایک طرفہ ہوتا تھا۔ انشورنس میں یہ بات نہیں ہوتی۔ اس لیے اسے انشورنس کی بجائے ضمان کہنا چاہیے۔

انشورنس کا مفہوم:

انشورنس انگریزی زبان کے لفظ Insure سے ہے جو وثوق دلانے اور ضمانت کے معنی میں آتا ہے۔ انشورنس کا اطلاق ایسے معاملے پر ہوتا ہے جس میں کوئی شخص یا ادارہ دوسرے شخص کو یہ ضمانت دیتا ہے کہ مستقبل میں پیش آنے والے فلاں ممکنہ خطرات کے نقصان کی تلافی وہ کرے گا۔ چنانچہ اس شرط پر دوسرا شخص ایک معینہ مدت تک ایک مقرر رقم اقساط کی صورت میں ادا کرتا ہے۔ عربی میں انشورنس کے لیے ”تامین“ کا لفظ استعمال ہوتا ہے جو ”امن“ سے ماخوذ ہے جس کا معنی طمانیت قلب اور خطرے سے محفوظ رہنا ہے، انشورنس



کے ذریعے بھی انسان مستقبل کے خطرات سے محفوظ رہتا ہے، اس لیے اسے تائین کہتے ہیں۔

انشورنس کی قسمیں:

منتظم اداروں کے لحاظ سے اس کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) گروپ انشورنس:

حکومت ملازمین کی فلاح بہبود کے لیے ایک پالیسی ترتیب دیتی ہے جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ملازمین کی تنخواہ سے قانوناً کچھ رقم ہر ماہ ادائیگی سے قبل ہی وضع کر لی جاتی ہے جو ایک فنڈ میں جمع ہوتی رہتی ہے۔ ملازم کی ریٹائرمنٹ، انتقال یا حادثے کی صورت میں خود ملازم یا اس کے ورثاء کو اضافی رقم کے ساتھ واپس کر دی جاتی ہے پھر آگے اس کی مختلف صورتیں ہیں۔ انشورنس کی یہ صورت غیر اختیاری ہے جس سے قانونی مجبوری کی وجہ سے بچنا انسان کے اختیار میں نہیں ہے اس لیے اس پر اتفاق ہے کہ اس قسم کی انشورنس کرانے کی صورت میں انسان عند اللہ بری ہوگا البتہ اضافی رقم کے متعلق دو نقطہ نظر ہیں۔

✽ اکثر علماء کے خیال میں اس سے حکومت کا مقصد نفع کماتا نہیں بلکہ ملازمین سے تعاون ہوتا ہے اور حکومت کی ذمہ داری بھی ہے کہ وہ ملازمین کی ضروریات کا خیال رکھے، اس لیے اضافی رقم وصول کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

✽ دوسری رائے یہ ہے کہ اضافی رقم ذاتی استعمال میں نہ لائی جائے بلکہ غرباء اور مساکین پر خرچ کر دی جائے۔

(۲) میوچل انشورنس:

اس کا انتظام امداد باہمی کی تنظیمیں کرتی ہیں۔ اس کا مقصد نقصان کی صورت میں ایک دوسرے سے تعاون کرنا ہے نہ کہ تجارت اور دوسروں کے مال سے حصول نفع۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کسی ادارے، جماعت یا قبیلے کے لوگ باہم مل کر ایک فنڈ تشکیل دیتے ہیں اور کسی رکن کو حادثہ پیش آنے کی صورت میں اس فنڈ سے اس کی مدد کی جاتی ہے۔ اگر فنڈ



میں جمع شدہ رقم کم پڑ جائے تو اراکین سے مزید وصول کی جاتی ہے اور اگر بچ جائے تو آئندہ سال کے لیے جمع کر لی جاتی ہے۔ اس کی بنیاد سراسر تعاون پر ہے جس میں کوئی شرعی قباحت نہیں پائی جاتی۔ اس لیے انشورنس کی یہ قسم جائز اور مباح ہے۔

(۳) کمرشل انشورنس:

انشورنس کی اس قسم کا انتظام کاروباری کمپنیاں کرتی ہیں جن کے پیش نظر لوگوں سے مالی تعاون کی بجائے مال کمانا ہوتا ہے۔ اس کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ بیمہ ہولڈر کمپنی کو ایک متعین رقم اقساط کی صورت میں مخصوص مدت تک ادا کرتا ہے اس کے عوض بیمہ کمپنی اسے یہ یقین دہانی کرواتی ہے کہ کمپنی اس کے فلاں نوعیت کے نقصان کی تلافی کرے گی، انشورنس کی یہ قسم بطور کاروبار اختیار کی جاتی ہے، اس لیے اسے کمرشل انشورنس کہا جاتا ہے۔

جب انشورنس کا لفظ بغیر کسی اضافی قید کے ذکر کیا جائے تو اس سے یہی قسم مراد ہوتی ہے اور محل نزاع بھی یہی ہے۔ اس کی مزید بے شمار قسمیں ہیں اگر ان سب کو مختصر بیان کیا جائے تو بنیادی طور پر ان کی تین قسمیں بنتی ہیں۔

لائف انشورنس:

انشورنس کمپنی کسی شخص سے یہ معاہدہ کرتی ہے کہ وہ ایک مقررہ رقم اقساط کی صورت میں کمپنی کو ادا کرے گا۔ اگر معینہ مدت میں اس شخص کا طبعی یا حادثے میں انتقال ہو گیا تو کمپنی طے شدہ رقم اس کے ورثاء کو ادا کرے گی۔ اگر وہ شخص معینہ مدت تک زندہ رہے تو ادا شدہ رقم مع اضافہ کے ساتھ واپس مل جاتی ہے۔ اس کی بعض صورتوں میں مدت کا تعین ہوتا ہے اور بعض میں نہیں۔

گڈ ز انشورنس:

اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک شخص معینہ مدت کے لیے ایک مقررہ رقم قسطوں میں کمپنی کو ادا کرتا ہے اگر حادثے کی وجہ سے انشورنس کروائی گئی چیز کا نقصان ہو جائے تو ادا شدہ رقم واپس نہیں ہوتی، انشورنس کی ان دو قسموں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ پہلی میں معینہ



مدت میں وفات نہ ہونے پر ادا شدہ رقم ادا کرنے کے ساتھ مل جاتی تھی دوسری صورت میں رقم واپس نہیں ہوتی۔

تھرڈ پارٹی انشورنس:

انسان اپنی غلطی، غفلت یا سستی کی وجہ سے دوسرے شخص کو پہنچنے والے نقصان کی ذمہ داری سے بچنے کے لیے جو انشورنس کرواتا ہے اسے تھرڈ پارٹی انشورنس کہتے ہیں۔ مثلاً اس غرض سے گاڑی انشورنس کروانا کہ گاڑی سے نقصان کی صورت میں مالک کی بجائے انشورنس کمپنی اس کا ازالہ کرے۔

کمرشل انشورنس کا شرعی حکم:

درج ذیل خرابیوں کی بنا پر کمرشل انشورنس کی تمام شکلیں ممنوع ہیں۔

❁ ان میں ربا کی دونوں قسمیں ربا النسیئۃ اور ربا الفضل پائی جاتی ہیں کیونکہ انشورنس ہولڈر نے کمپنی کو متعین رقم اس شرط پر ادا کرنا ہوتی ہے کہ حادثے کی صورت میں کمپنی اس کو طے شدہ رقم ادا کرے گی، وہ رقم یا تو اس کی ادا کی ہوئی رقم سے زیادہ ہو گی یا کم۔ اگر زیادہ ہوگی تو اس میں ربا النسیئۃ اور ربا الفضل دونوں کی آمیزش ہوگی اور یہ دونوں حرام ہیں، کم ہونے کی صورت میں ربا النسیئۃ کا معاملہ قرار پائے گا۔

❁ یہ غرر پر مشتمل ہے کیونکہ اس میں ادائیگی ایک ایسے واقعہ پر منحصر ہوتی ہے۔ جس میں دونوں احتمال پائے جاتے ہیں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بیمہ ہولڈر نے ابھی کچھ قسطیں ہی ادا کی ہوں اور واقعہ پیش آجائے اس پر کمپنی کے ذمہ مکمل ادائیگی آجائے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ وہ واقعہ پیش نہ آئے اور اس کی تمام اقساط بغیر معاوضے کے کمپنی کے کھاتے میں چلی جائیں۔

❁ شرعی طور پر کسی پر ضمان لازم ہونے کی ایک ہی صورت ہے نقصان براہ راست اس نے کیا ہو یا کم از کم اس نقصان کا سبب بنا ہو، یہاں نہ تو انشورنس کمپنی نے نقصان کیا



ہوتا ہے اور نہ ہی وہ اس کا سبب ہوتی ہے۔ لہذا اس پر ضمان لازم کرنا شرعاً جائز نہیں، اس کو ”عقد مولات“ پر قیاس کرنا ”قیاس مع الفارق“ ہے۔

✽ ایک تو اس لیے کہ عقد مولات میں بنیادی شرط یہ ہے کہ عاقد کا کوئی وارث زندہ نہ ہو، اگر کوئی وارث ہو تو یہ باطل قرار پاتا ہے۔

✽ دوسرا اس لیے کہ انشورنس کا مقصد مادی فائدہ کا حصول ہے جس میں رہا اور غرر کی آمیزش ہے۔ جب کہ عقد مولات میں ہر طرح کے حالات میں تعاون مقصود ہوتا ہے۔

✽ تیسرا اس لیے کہ فقہاء کے ایک طبقہ کی رائے میں عقد مولات کا حکم اب باقی نہیں رہا بلکہ منسوخ ہو چکا ہے۔

لیزنگ:

مروجہ جدید مالی معاملات میں سے ایک لیزنگ بھی ہے لیز اصل میں عربی کے لفظ الاجارۃ کا ترجمہ ہے جو شرعی اصطلاح ہے لیکن مروجہ لیزنگ شرعی اجارہ سے مختلف ہے۔ شرعی اجارہ کا مفہوم تو صرف اتنا ہے۔

((بيع منفعة معلومة باجر معلوم)) [عمدة القاری شرح صحیح بخاری:

ج ۱۸، ص ۱۲۵۱

”طے شدہ اجرت کے بدلے طے شدہ منفعت فروخت کرنا“

اس کی دو قسمیں ہیں:

- ۱۔ معاوضے کے بدلے کسی شخص (انجینئر وغیرہ) کی خدمات حاصل کرنا۔
- ۲۔ اپنی ذاتی چیز جیسے گاڑی یا مکان کا حق استعمال کسی دوسرے کی طرف منتقل کرنا اور اس کے عوض کرایہ وصول کرنا۔

جب لیزنگ کا لفظ بولا جاتا ہے تو اقتصادی ماہرین کے نزدیک اس سے عموماً اجارہ کی یہ آخری قسم ہی مراد ہوتی ہے۔

صحیح بخاری میں اجارہ کے عنوان کے تحت دونوں قسموں کا بیان ہے اجارہ کی اس قسم



میں چوں کہ چیز اصل مالک کی ملکیت ہی ہوتی ہے مستاجر کرایہ کے عوض صرف اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس لیے ملکیتی اخراجات مستاجر کے ذمے ہوں گے۔ مثلاً مکان کرائے پر دیا گیا ہے تو اس کی پراپرٹی ٹیکس مالک ادا کرے گا لیکن بجلی، گیس اور پانی کا بل مستاجر کے ذمہ ہوگا۔ اسی طرح اگر کرایہ پردی گئی چیز کا ایسا نقصان ہو جائے جس میں مستاجر کی غلطی، غفلت یا کوتاہی کا عمل دخل نہ ہو تو وہ نقصان بھی مالک ہی برداشت کرے گا۔

لیزنگ کا جدید مفہوم:

اس کے برعکس انیسویں صدی عیسوی سے لیزنگ کی ایک نئی قسم متعارف ہوئی جس کو عربی میں ”البيع الايجارى“ یعنی وہ اجارہ داری جس کی انتہائیچ پر ہوتی ہے اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ بینک کسی کو کچھ سالوں کے لیے گاڑی خرید کر لیز پر دیتا ہے اس کا کرایہ اقساط میں وصول کیا جاتا ہے۔ بینک کرایہ طے کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھتا ہے کہ اس عرصے میں گاڑی کی قیمت مع اتنے نفع کے جو اس عرصے میں بینک کو اس رقم پر سود کی شکل میں حاصل ہونا تھا وصول ہو جاتے ہیں جب گاڑی مکمل اقساط ادا کر دیتا ہے تو گاڑی اس کی ملکیت ہو جاتی ہے اس طرح ابتدا میں یہ اجارہ ہوتا ہے جو آخر میں بیع میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس عرصے میں گاڑی کے ہر طرح کے نقصانات کی ذمہ داری گاڑی کی ہوتی ہے بعض اہل علم کی رائے میں یہ ایک جدید صورت ہے۔ دین میں اس کے متعلق کوئی ممانعت نہیں ہے اس لیے جائز ہے۔ جب کہ بعض حضرات کے نزدیک یہ ایک عقد میں دو عقد جمع ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے۔ ہمارا خیال میں اس میں زیادہ قابل اعتراض پہلو سود کی آمیزش کا ہے۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ گاڑی جب بینک کے پاس گاڑی لینے جاتا ہے تو وہ اس کی قیمت کا کچھ حصہ ڈاؤن پے منٹ (Down Payment) کے نام سے پہلے ادا کرتا ہے جو زیادہ بھی ہو سکتا ہے اور کم بھی لیکن ایک خاص شرح (گاڑی کی قیمت کا دس فیصد) سے کم نہیں ہوتا اب بینک نے کرائے کے نام پر جو اضافی رقم وصول کرنا ہوتی ہے اس کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ ڈاؤن پے منٹ کی رقم کتنی ہے؟ اگر وہ زیادہ ہے تو اضافی رقم زیادہ



وصول کی جائے گی۔ اس بارے میں ہم نے مسلم کمرشل بینک کے ایک ذمہ دار سے جو معلومات حاصل کی ہیں ان کے مطابق اگر آپ بینک سے Baleno گاڑی لیتے ہیں اور ڈاؤن پے منٹ پانچ لاکھ ادا کرتے ہیں تو آپ کو پانچ سال کے لیے ۹۷۳۸ روپے ماہانہ قسط جمع کروانا ہوگی جو ۵۸۴۲۸ روپے بنتے ہیں۔ اس میں پانچ لاکھ ڈاؤن پے منٹ جمع کر لیں تو مکمل ۱۰۸۴۲۶۰ روپے بنیں گے۔ اگر آپ ڈاؤن پے منٹ دو لاکھ کرتے ہیں تو آپ پانچ سال تک ۶۴۰۸ روپے کی ماہانہ قسط جمع کروائیں گے جو ۹۸۴۳۸ روپے بنتے ہیں۔ دو لاکھ ڈاؤن پے منٹ کے نام سے پہلے ادا کیا جا چکا ہے اس طرح کل رقم ۱۱۸۴۳۸۰ روپے ہوگی۔ پہلی صورت میں ایک لاکھ دو سو روپے کم اور دوسری صورت میں زیادہ کیوں؟ سیدھی سی بات ہے کہ یہ سودی معاملہ ہے پہلی صورت میں بینک کو چونکہ کم پیسے دینے پڑے اس لیے اس کا سود کم اور دوسری صورت میں زیادہ رقم دینا پڑی اس لیے سود بھی زیادہ بنا۔ اگر یہ حقیقی اجارہ ہوتا تو یہ فرق نہ ہوتا!! کیونکہ اجارہ میں کرائے کا تعلق حق استعمال سے ہوتا ہے جو دونوں صورتوں میں برابر ہے نہ کہ اس بات سے کہ اس میں بینک کے کتنے پیسے استعمال ہوتے ہیں نیز اگر یہ حقیقی اجارہ ہوتا تو بینک اس کے نقصان کا بھی ذمہ دار ہوتا، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اصل میں یہ سودی معاملہ ہے جسے اجارہ کا نام دیا گیا ہے۔ حقیقی اجارہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

ایک شبہ کا ازالہ:

بظاہر یہ بیع قسط کے مشابہ ہے اس لیے بعض حضرات اسے بیع قسط قرار دے کر اس کا جواز ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن درج ذیل وجوہ کے باعث یہ درست نہیں:

✽ سطور بالا میں ہم نے اس کی جو تفصیل بیان کی ہے اس کے مطابق اسے بیع قسط قرار دینے کی قطعاً گنجائش نہیں۔

✽ یہ دراصل دو عقد پر مشتمل ہے:

(۱) عقد اجارہ۔ (ب) عقد بیع۔



جب کہ بیع قسط میں صرف ایک عقد ہوتا ہے بیع اور اجارہ الگ الگ اصطلاحات ہیں اور ہر ایک کے احکام بھی مختلف ہیں۔

بیع قسط میں قیمت تو ادھار ہوتی ہے مگر ملکیت فوراً خریدار کے نام منتقل ہو جاتی ہے۔ لیکن یہاں ملکیت تمام اقساط کی ادائیگی کے ساتھ مشروط ہے یہ عقد بیع کے منافی ہے کیونکہ بیع کا اصل مقصد ہی یہی ہے کہ چیز مکمل طور پر فروخت کنندہ کی ملکیت سے نکل کر خریدار کی ملکیت میں آجائے۔

لیزنگ کا متبادل:

- اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ نے اپنے اجلاس جو ۱۵ تا ۱۷ دسمبر ۱۹۸۸ء کو کویت میں منعقد ہوا اس میں مروجہ لیزنگ کے درج ذیل دو متبادل تجویز کیے تھے۔
- ۱۔ مدت ختم ہونے کے بعد مستاجر کے پاس تین اختیار ہوں۔
 - ۱۔ گاڑی مالک کے حوالے کر کے عقد اجارہ ختم کر دے۔
 - ۲۔ نئے سرے سے عقد اجارہ کر لے۔
 - ۳۔ گاڑی خرید لے۔

[بحوالہ: بحوث فی الاقتصاد الاسلامی للڈکٹور علی القراء الداعی]

اگرچہ اس پر بھی بعض علماء کے تحفظات ہیں مثلاً مدت اجارہ پوری ہونے پر مستاجر تو آزاد ہے مگر مستاجر کی پسند کا پابند ہے لیکن یہ اعتراض کوئی زیادہ وزنی نہیں اس لیے یہ صورت شرعی طور پر جائز ہے۔ بشرطیکہ اس کی عملی تطبیق میں کوئی گڑبڑ نہ ہو۔

مروجہ لیزنگ کا دوسرا متبادل:

اسلامی فقہ اکیڈمی نے اس کی جگہ دوسرا متبادل بیع قسط تجویز کیا ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اس میں انتقال ملکیت آخری قسط کی ادائیگی کے ساتھ معلق نہ ہو بلکہ دوسری ضمانتیں ہوں۔ [حوالہ مذکورہ]



شیرز (حصص) کی خرید و فروخت:

دوِ حاضر کے مالی معاملات میں سے ایک شیرز کی تجارت کا مسئلہ بھی ہے۔ جو فی زمانہ تجارت کی سب سے زیادہ مقبول صورت ہے حتیٰ کہ کسی ملک کی اقتصادی ترقی اور تجارتی گہما گہمی کا تعین بھی شاک ایکچینج کے اتار چڑھاؤ سے کیا جاتا ہے، گویا سرمایہ کاری کا رخ تانے میں اس کی حیثیت بیرومیٹر کی ہے۔

شیرز کی تاریخ:

چند افراد کا باہم مل کر شراکت کے اصولوں کے مطابق کاروبار کرنا زمانہ قدیم سے رائج ہے۔ عصرِ حاضر میں اس کو پارٹنرشپ کہا جاتا ہے۔ سترھویں صدی عیسوی میں شراکت سے ملتی جلتی کاروبار کی ایک نئی شکل سامنے آئی جس کو جوائنٹ شاک کمپنی کہا جاتا ہے۔ مشترکہ کاروبار کا یہ ایک نیا تصور تھا جس سے پہلے لوگ شناس نہیں تھے اس لیے کتب فقہ میں اس کا ذکر بھی نہیں ملتا۔ اس سے پہلے شخصی کاروبار ہوتا تھا یا پھر شراکت و مضاربہ کی بنیاد پر۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا کی پہلی شاک ایکچینج ایمسٹرڈیم ہالینڈ میں ۱۶۱۱ء میں قائم ہوئی۔ برصغیر میں پہلی شاک ایکچینج اٹھارویں صدی کے آخری نصف میں بمبئی میں قائم ہوئی تھی۔ اس کاروبار میں غیر معمولی وسعت اس وقت پیدا ہوئی جب بیسویں صدی کے آخری نصف میں تجارتی میدان میں اصلاحات کا عمل شروع ہوا اور اس کے نتیجے میں نئی نئی کمپنیاں قائم ہونے لگیں۔ درمیان میں کچھ عرصہ کے لیے اس پر جمود بھی طاری رہا بالخصوص ان ممالک میں جہاں صنعتوں کو قومیا نے (Nationalized) کارِ حجام غالب تھا۔

شیرز کی حقیقت:

شیرز کے لیے اردو میں حصص اور عربی میں اَسْهُم کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ شیرز کس چیز کی نمائندگی کرتا ہے اس سلسلے میں ممالک کی مختلف آراء ہیں ایک گروہ کے خیال میں حصص دراصل کمپنی میں شیرز ہولڈرز کے متناسب حصہ کی نمائندگی کا نام ہے اس کی توضیح یوں ہے کہ کمپنی کا کل منظور شدہ سرمایہ مساوی اجزاء میں عام طور پر دس دس روپے میں تقسیم

کر دیا جاتا ہے ہر جزاء کو حصہ کہا جاتا ہے۔ جو لوگ حصص خریدتے ہیں وہ اس تناسب سے کمپنی کے حصہ دار ہوتے ہیں اگر کوئی شیئر ہولڈر اپنا حصہ فروخت کرنا چاہے تو وہ شاک مارکیٹ میں فروخت بھی کر سکتا ہے۔

دوسرے گروہ کی رائے میں شیئرز محض کمپنی کو دیے ہوئے قرض کا دستاویزی ثبوت ہیں۔ ان حضرات کا استدلال اس بات سے ہے کہ اگر شیئر ہولڈر دیوالیہ ہو جائے تو کمپنی میں اس کے تناسب حصے کی ضبطی نہیں ہوتی جس کی نمائندگی یہ شیئرز کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ شیئرز ہولڈر کمپنی کا حصہ دار نہیں ہوتا بلکہ اس نے کمپنی کو قرض دیا ہوتا ہے۔ لیکن دوجہ سے یہ استدلال درست نہیں۔

❁ دیوالیہ ہونے کی صورت میں کمپنی میں اس کے حصے کی قرقی نہ ہونے کے وجہ یہ نہیں کہ کمپنی میں اس کی ملکیت نہیں بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ کمپنی کا اصول ہے کہ کوئی شخص حصہ دار بننے کے بعد کمپنی کی تحویل سے قبل اپنا حصہ نہیں نکلا سکتا، ہاں! ضرورت کے وقت شاک مارکیٹ میں فروخت کر سکتا ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کمپنی میں اس کی ملکیت نہیں تھی۔ جس طرح بعض فقہاء کے نزدیک دیوالیہ ہونے کی صورت میں مکان قرق نہیں ہوتا۔ اس کا یہ معنی تو نہیں کہ وہ مکان کا مالک بھی نہیں تھا۔

❁ اگر کمپنی تحلیل ہو جائے تو اس کے اثاثوں کی تقسیم سے ہر شیئرز ہولڈر کو اس کے حصے کے تناسب سے حصہ ملے گا جس کی مالیت اس کی لگائی ہوئی رقم سے زیادہ بھی ہو سکتی ہے اور کم بھی۔ اگر ملکیت نہ ہوتی تو حصہ ملنے کا کیا معنی؟

شرعی حکم:

جن حضرات کی رائے میں شیئر کمپنی کو دیئے گئے قرض کی نمائندگی کرتا ہے ان کے نزدیک شیئرز کا کاروبار حرام ہے بعض علماء تو شیئرز کے لین دین کو قمار اور سٹہ بازی بھی قرار دیتے ہیں لیکن گزشتہ طور میں ہم نے شیئرز کی حقیقت کے متعلق جو تفصیل بیان کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شیئرز کی فروخت درحقیقت کمپنی میں شیئرز ہولڈر کے تناسب حصے کی



فروخت ہے۔ جس کی کمی بیشی کے ساتھ خرید و فروخت میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ خواہ ڈیویڈنڈ حاصل کرنے کی نیت ہو یا قیمت بڑھنے کی صورت میں آگے فروخت کرنا مقصود ہو۔

یہاں یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ یہ جواز تین پابندیوں کے ساتھ مشروط ہے۔

- ۱۔ جس کمپنی کے شیئرز خریدے جا رہے ہیں اس کا کاروبار حلال ہو سو دھوکہ میں ملوث نہ ہو۔
- ۲۔ کمپنی کے اثاثہ جات صرف نقد اور قرضوں کی شکل میں ہی نہ ہوں بلکہ جائیداد اور مال کی شکل میں بھی ہو۔

۳۔ فروخت اپنی سادہ شکل میں ہو کہ خریدار رقم دے اور فروخت کنندہ حصص اس کے نام منتقل کر دے اگر حصص کے کاروبار کی کسی قسم کا شرعی اصول سے ٹکراؤ ہو تو وہ صورت بلاشبہ ناجائز ہوگی۔

سعودی عرب کے سابق مفتی اعظم شیخ عبدالعزیز بن باز رحمۃ اللہ علیہ کی سربراہی میں قائم مستقل فتویٰ کمیٹی نے بھی بعض شرطوں کے ساتھ اس کو جائز قرار دیا ہے۔ چنانچہ ”فتاویٰ اللجنة الدائمة“ میں ہے:

((اذا كانت الاسهم لا تمثل نقودا تمثيلا كلياً او غالباً ، وانما تمثل ارضا او سيارات او عمارات ونحو ذلك ، وهى معلومة للبائع والمشتري ، حاز بيعها وشراؤها بضمن حال او مؤجل على دفعة او دفعات لعموم أدلة جواز البيع والشراء)) [فتاوى اللجنة الدائمة - ج ۱۳ ، ص ۳۲۱]

”جب شیئرز کلیتاً یا غالب طور پر نقدی کی نمائندگی نہ کر رہے ہوں بلکہ زمین یا گاڑیوں یا عمارات اور اس طرح کی دوسری چیزوں کی نمائندگی کر رہے ہوں اور بائع اور مشتری کو معلوم بھی ہو تو خرید و فروخت کے عمومی دلائل کی بنا پر نقد یا ادھار قیمت پر ان کی خرید و فروخت جائز ہے۔ ادھار کی صورت میں خواہ قیمت ایک ہی قسط میں ادا کی جانی ہو یا متعدد اقساط میں۔“

شیرز کی خرید و فروخت کی بعض ناجائز صورتیں:

ذیل میں حصص کی خرید و فروخت کی ہم دو ایسی صورتیں بیان کرتے ہیں جن پر شکاک آپہنچ میں بکثرت عمل ہو رہا ہے مگر وہ شرعی اصول کی مخالفت کی وجہ سے ناجائز ہیں۔

فیوچر سیل:

ایک شخص دوسرے سے یہ معاہدہ کرتا ہے کہ وہ اتنی مقدار یا تعداد میں فلاں چیز مستقبل کی فلاں تاریخ کو اس قیمت پر جو اس وقت واجب الادا ہوگی اس کو ادا کرے گا یا اس وقت اس کی قیمت کی خرید و فروخت میں جو فرق ہوگا وہ ایڈجسٹ کرے گا یہ صورت ناجائز ہے۔ ایک تو اس لیے کہ اس میں حصص اور قیمت دونوں ادھار ہیں فروخت کنندہ نے حصص بعد میں دینے ہیں اور خریدار نے قیمت بعد میں ادا کرنی ہے۔

دوسرا اس لیے کہ اس میں چیز کو قبضہ میں لینے سے پہلے فروخت کر دیا جاتا ہے جو کہ شرعاً منع ہے۔ بعض حضرات اسے بیع سلم سے قیاس کرتے ہیں جو درست نہیں اس کی تین وجوہ ہیں:

❁ شیرز میں بیع سلم نہیں ہو سکتی کیونکہ متعین باغ یا کھیت کی پیداوار میں سلم جائز نہیں جبکہ شیرز میں کمپنی کا نام ذکر کرنا ضروری ہوتا ہے اس سے اس کی حیثیت متعین چیز میں بیع سلم کی ہو جاتی ہے جو ناجائز ہے۔

❁ بیع سلم میں چیز کی مکمل قیمت پہلے ادا کرنا ضروری ہے جو یہاں نہیں۔

❁ بیع سلم میں چیز قبضہ سے قبل فروخت کرنی منع ہے۔ لیکن فیوچر سیل میں حوالگی کی تاریخ سے قبل کئی سودے ہو چکے ہوتے ہیں۔

پیشگی فروخت میں اگر صرف فرق برابر کرنا مقصود ہو تو یہ سٹہ بازی ہوگی جو حرام ہے۔

بدلہ (Carey Over):

دو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط سودے جو بیک وقت ہوتے ہیں ایک فریق اپنی موجودہ حیثیت (Position) یعنی وہ خریدے ہوئے حصص جو ابھی فروخت نہیں کیے گئے



حالیہ ادائیگی سے اگلی ادائیگی میں منتقل کر رہا ہوتا ہے اور اس کے لیے وہ کچھ اضافی رقم ادا کرتا ہے۔ اسے عام زبان میں بدلہ کہا جاتا ہے۔ جس کا معنی ہے ادائیگی کا دن بدل جانا۔ اسے سادہ الفاظ میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ ایک آدمی نے حصص تو خرید لیے لیکن اس کے پاس ادائیگی کے لیے رقم نہیں وہ یہ چاہتا ہے کہ میری یہ حیثیت آئندہ ادائیگی میں منتقل ہو جائے دوسرا آدمی اس شرط پر وہ حصص خرید لیتا ہے کہ اس نے اگلی ادائیگی میں اضافی رقم لے کر واپس کرنے ہوتے ہیں۔ یہ جائز نہیں کیونکہ یہ سودا واپسی مع اضافہ کے ساتھ مشروط ہے جو جائز نہیں۔



WWW.KITABOSUNNAT.COM

کاروباری دستاویزات

یہ امر واقع ہے کہ نقد یا کرنسی خواہ کتنی ہی مضبوط قوت خرید کی حامل کیوں نہ ہو تجارتی ضروریات کے مقابلہ میں ناکافی ہوتی ہے۔ چنانچہ تجارتی حلقوں نے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ایسی دستاویزات متعارف کروائیں ہیں جو کاروباری طبقہ میں نقد کی طرح ہی معتبر سمجھی جاتی ہیں۔ ان کو بینکاری کی اصطلاح میں ”آلات اعتبار“ انگریزی میں Instruments of credit اور عربی میں ”الاوراق التجارية“ کہا جاتا ہے۔ یہ دستاویزات یا آلات اگرچہ تجارتی سرگرمیوں کے علاوہ بھی استعمال ہوتی ہیں لیکن اصل میں ان کا اجراء کاروباری حضرات نے اپنی سہولت کی خاطر کیا تھا اس لیے ان کو ”الاوراق التجارية“ (کمرشل پیپرز) کا نام دیا جاتا ہے۔

کاروباری دستاویزات سے مراد:

جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ ان دستاویزات کے لیے آلات اعتبار کی اصطلاح وضع ہے ماہرین آلہ اعتبار کی تعریف یوں کرتے ہیں:

ایسی دستاویزات جو کاروباری لین دین میں زر کا نعم البدل ہوں اور مستقبل کی ادائیگی کے لیے استعمال ہوتی ہوں آلات اعتبار کہلاتی ہیں۔ جیسے چیک، ہنڈی اور تحریری وعدہ وغیرہ۔ [اصول بنکاری، ص ۳۳۸ از قاضی احتشام]

عربی میں ان کی تعریف اس طرح کی جاتی ہے:

((الاوراق التجارية صكوك ثابتة للتداول تمثل حقا نقديا و

تستحق الدفع بمجرد الاطلاع او بعد اجل قصير ويجرى العرف

على قبولها كاداة للوفاء)) [البنوك الاسلامية بين النظرية

والتطبيق: ص ۱۳۴ للدكتور محمد بن عبد الله الطيار]



”کمرشل پیپرز سے باہمی لین دین کی وہ دستاویزی ثبوت مراد ہیں جو نقدی حق کی نمائندگی کرتے ہیں اور نوٹس موصول ہوتے ہی یا مختصر مدت بعد واجب الادا ہوتے ہیں عرف ان کو ایک آلہ ادائیگی کے طور پر قبول کرتا ہے۔“

چونکہ ان دستاویزات کے حقوق کسی دوسرے شخص کو بھی منتقل کیے جاسکتے ہیں اس لیے ان کو (Negotiable instruments) یعنی تحویل پذیر دستاویزات یا تحویل پذیر آلات اعتباراً کہا جاتا ہے۔

ان کی تین بڑی قسمیں ہیں:

۱۔ ہنڈی عربی میں ”الکمبرالیۃ“ انگلش میں (Bill of exchange)۔

۲۔ پرومیری نوٹ عربی میں ”السند الاذنی“۔

۳۔ چیک۔

اور اق تجاریہ کی تاریخ ابتداء:

ان کی شروعات کے بارہ میں یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے کیونکہ اس میں کافی اختلاف ہے۔ بعض محققین کی رائے میں ان کے موجد اہل یونان ہیں۔ بعض ان کا تعلق حواری کے دور سے جوڑتے ہیں بعض کے نزدیک یہ اہل چین جبکہ بعض دوسرے حضرات کے خیال میں اہل فارس کی ایجاد ہے۔ لیکن یہ سب آراء دلائل کی تائید سے محروم ہیں اس لیے حقیقت یہی ہے کہ ان کا ابتدائی دور متعین کرنا مشکل ہے تاہم اس اختلاف کے باوجود اکثر محققین کی رائے میں ایک بات یقینی ہے کہ ان کا استعمال بارہویں صدی عیسوی میں عام ہو گیا تھا۔ کیونکہ اس صدی کے آغاز میں نقدی کی نقل و حرکت کو محفوظ بنانے کے لیے ہنڈی ایک ذریعہ کے طور پر استعمال ہونا شروع ہو گئی تھی اور کچھ عرصہ بعد ادائیگی کے لیے اور ایک ہی شہر کے اندر بھی استعمال ہونا شروع ہو گئی۔ پرومیری نوٹ کا سترھویں صدی عیسوی میں ہوا۔ اسی صدی کے آخر ۱۷۹۳ء میں انگلینڈ بینک کے قیام کے بعد چیک کا استعمال شروع ہوا۔ [احکام الاوراق التجارية فی فقہ الاسلامی، ص: ۲۲، ۲۳، الدكتور سعد

بن الترقی]



کاروباری دستاویزات اور کاغذی کرنسی میں فرق:

اگرچہ تجارتی حلقوں میں یہ دستاویزات کرنسی کی طرح ہی معتبر سمجھی جاتی ہیں یہاں تک کہ بعض نے ان کو مجازی طور پر کرنسی بھی کہا ہے لیکن ان دونوں میں کئی اعتبار سے فرق ہے۔ مثلاً:

❁ قرض کی ادائیگی میں پیپر کرنسی کو قبول کرنا ضروری ہوتا ہے صاحب حق انکار نہیں کر سکتا جب کہ کمرشل پیپرز میں یہ پابندی نہیں ہوتی اگر وہ انکار کر دے تو اس پر جبر نہیں کیا جاسکتا۔

❁ اگر صاحب حق ہنڈی میں درج رقم میعاد سے قبل وصول کرنا چاہے تو کٹوتی ہوتی ہے کرنسی میں یہ نہیں ہوتا۔

❁ کمرشل پیپرز میں مدت متعین ہوتی ہے جب کہ کرنسی غیر معینہ عرصہ کے لیے ہوتی ہے بشرطیکہ حکومت رائج کرنسی ختم کر کے نئی جاری نہ کر دے۔

❁ کاغذی کرنسی حکومت یا اس کی زیر نگرانی کوئی ادارہ ہی جاری کر سکتا ہے مگر کاروباری دستاویزات مختلف افراد اور ادارے بھی جاری کرتے ہیں۔

❁ کاروباری دستاویزات کے حقوق دوسرے کے نام منتقل کرتے وقت تظہیر (پشت پر دستخط) کی ضرورت ہوتی ہے۔ کرنسی اس کی محتاج نہیں ہوتی۔ ملاحظہ ہو: ابحات ہیئۃ

کبار العلماء بالمملكة العربية السعودية: ۵/۳۲۵ احکام اوراق

التجارية في الفقه الاسلامي، ص: ۵۹، ۴۰ لدكتور سعد بن التريکی۔

کمرشل اور فنانشل پیپرز کا باہمی فرق:

فنانشل پیپرز کو عربی میں ”الاوراق المالية“ کہتے ہیں ان سے مراد کمپنیوں کے شیئرز اور بانڈز (کمپنی حصول قرض کے لیے جاری کرتی ہے) ہیں چنانچہ ڈاکٹر رفیق یونس مصری لکھتے ہیں:



((الاوراق المالية هي الاسهم والسندات)) [المصارف الإسلامية:

ص: ٤٨]

”اوراق مالیہ (فنانشل پیپرز) سے مراد شیئرز اور بانڈز ہیں۔“

ڈاکٹر احمد بن الخلیل کہتے ہیں اوراق مالیہ کی دو قسمیں ہیں:

(۱) شیئرز (۲) بانڈز

مزید لکھتے ہیں:

”کمرشل پیپرز فنانشل پیپرز سے مختلف ہیں اور دونوں کے حاملین کے حقوق بھی الگ

الگ ہیں کمرشل پیپرز کا مقصد مالی حقوق کی حفاظت اور دیون (Debt) ادا کرنا ہے جب

کہ فنانشل پیپرز کا مقصد منافع کا حصول اور کمپنی میں دوسرے حقوق حاصل کرنا ہے۔“

[الاسهم والسندات واحكامها في الفقه الاسلامي: ص ۳۳۳۲]

ان دونوں کے باہمی فرق کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

❁ کمرشل پیپرز عام طور پر دیون کی نمائندگی کرتے ہیں جو نوٹس موصول ہونے پر یا مختصر

مدت بعد واجب الادا ہوتے ہیں۔ جب کہ فنانشل پیپرز سرمایہ کاری قرض کی رسید

ہوتے ہیں۔

❁ فنانشل پیپرز کے حاملین کمپنی کے منافع میں حصہ دار ہوتے ہیں جب کہ کمرشل پیپرز

میں کوئی اضافی فائدہ نہیں ہوتا۔

❁ کمرشل پیپرز ہر وہ شخص جاری کر سکتا ہے جو ان کے اجراء کا اہل ہو لیکن فنانشل پیپرز

صرف مالیاتی ادارے اور کمپنیاں ہی جاری کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کئی لحاظ سے

فرق ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہوں: احکام الاوراق التجارية في الفقه

الاسلامی ص: ۶۱۱-۶۲۲ سعد بن الترقی۔

کمرشل پیپرز کی مختلف قسمیں اور ان میں باہمی فرق:

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ کمرشل پیپرز کی تین بڑی قسمیں ہنڈی، پرومٹری نوٹ اور

چیک ہیں۔ اب یہاں ہر ایک کا مفہوم ادران کا باہمی فرق واضح کیا جاتا ہے۔

ہنڈی:

ایک ایسی دستاویز ہے جس میں فروخت کرنے والا یا قرض خواہ خریدار یا مقروض کو حکم دیتا ہے کہ وہ ایک مخصوص رقم معینہ عرصہ بعد اسے یا جس کو وہ کہے ادا کر دے۔
[اصول بنکاری، ص: ۲۲۵، ۲۲۶ از قاضی احتشام]

اس کی توضیح یوں ہے کہ ”الف“ ”ب“ کو مثلاً ایک لاکھ کا سامان بیچتا ہے۔ ”ب“ نقد ادائیگی کرنے کی بجائے ایک مہینہ کی مہلت مانگتا ہے اب ”الف“ مال روانہ کرنے کے ساتھ تحریر شدہ ہنڈی بھی ارسال کرے گا۔ ”ب“ ہنڈی پر قبول ہے کے الفاظ لکھ کر اور اپنے دستخط کر کے واپس ”الف“ کو بھیج دے گا۔ قبولیت اور دستخط کے بغیر ہنڈی کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوتی۔ طے شدہ میعاد گزرنے پر ”الف“ ”ب“ کو ہنڈی پیش کر کے اپنی رقم وصول کر لے گا۔ عام طور پر فروخت کنندہ یہ کام خود کرنے کی بجائے بینک کی خدمات حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ وہ ہنڈی بینک میں جمع کرواتا ہے بینک اس کی میعاد ختم ہونے سے کچھ دن پہلے خریدار کو نوٹس بھیجتا ہے۔ پھر طے شدہ مدت پوری ہونے پر رقم وصول کر کے فروخت کنندہ کے کھاتے میں جمع کر دیتا ہے۔ بینک اس خدمت کا معاوضہ لیتا ہے۔ اگر فروخت کنندہ کو رقم کی فوری ضرورت ہو تو وہ اس کی پشت پر دستخط کر کے اس کے حقوق بینک یا کسی تیسرے شخص کے نام بھی منتقل کر کے اس سے رقم وصول پاسکتا ہے بینک یا وہ شخص اس پر تحریر شدہ رقم میں ایک خاص شرح کے مطابق بالعموم مروجہ شرح سود کے مساوی کٹوتی بھی کرتا ہے۔ میعاد پوری ہونے پر بینک یا تیسرا شخص وہ رقم ہنڈی جاری کرنے والے سے وصول پالیتا ہے۔ اس کٹوتی کو بٹہ لگانا کہا جاتا ہے (عربی میں ”خصم الكمبیلہ“ انگریزی میں (Discount bil of Exchange) پشت پر دستخط کرنے کو ظہیر (Endorsment) کہتے ہیں۔



پرومیزی نوٹ:

جس میں مقروض اپنے قرض خواہ یا خریدار اپنے فروخت کار کو ایک مقررہ رقم عندالطلب یا ایک خاص عرصے بعد ادا کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔ [اصول بنکاری: ص ۲۴۱]

ہنڈی میں تین فریق ہوتے ہیں:

۱۔ مرتب کنندہ (الساحب Drawer):

اس سے مراد وہ شخص ہے جو ہنڈی لکھتا ہے اور اس نے دوسرے شخص سے قرض لینا ہوتا ہے۔

۲۔ مرتب الیہ (المسحوب علیہ Drawee):

اس سے مراد وہ شخص ہے جو مقروض ہوتا ہے اس کے نام ہنڈی تحریر کی جاتی ہے اور وہ ہنڈی پر دستخط کر کے اس کو قبول کرتا ہے۔

۳۔ وصول کنندہ (المستفید Payee):

یعنی وہ شخص ہنڈی کی رقم وصول پاتا ہے یہ مرتب کنندہ خود بھی ہو سکتا ہے یا وہ شخص جس کے پاس ہنڈی موجود ہو۔ [اصول بنکاری: ص ۲۲۵-۲۲۶]

پرومیزی نوٹ میں صرف دو فریق ہوتے ہیں:

۱۔ مرتب کنندہ: یہ وہ شخص ہوتا ہے جس نے قرض لیا یا ادھار مال خرید رکھا ہو۔

۲۔ وصول کنندہ: وہ شخص جس نے تحریری وعدہ کی رقم وصول کرنی ہو اور یہ عموماً قرض خواہ ہوتا ہے۔ [اصول بنکاری: ص ۲۴۱]

چیک:

یہ کھاتہ دار کی طرف سے بینک کے نام ایک غیر مشروط حکم نامہ ہے جس میں وہ بینک کو ہدایت دیتا ہے کہ وہ چیک پر درج شدہ رقم اس یا کسی مخصوص شخص یا حامل چیک کو ادا کرے دوسرے لفظوں میں چیک ایک ایسی دستاویز ہے جو بینک سے رقم نکلوانے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ [اصول بنکاری: ص ۱۹۵]

اس میں مرتب کنندہ (الساحب) کھاتہ دار ہوتا ہے اور مرتب الیہ (المسحوب علیہ) وہ بینک جس کے نام چیک جاری کیا جاتا ہے جب کہ وصول کنندہ (المستفید) وہ شخص ہوتا ہے جو بینک سے رقم وصول پاتا ہے وہ چیک جاری کرنے والا خود بھی ہو سکتا ہے اور کوئی دوسرا بھی۔ علاوہ ازیں چیک جاری کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ اس پر زیادہ سے زیادہ اتنی ہی رقم درج کی جائے جتنی کھاتے میں موجود ہو۔ اس سے تینوں کا باہمی فرق بھی واضح ہو گیا ہے۔ تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

شرعی حکم:

ان دستاویزات کے متعلق تین امور خاص طور پر تنبیہ طلب ہیں۔

- ۱۔ باہمی لین دین کے وقت ان کو لکھنے کا حکم۔
 - ۲۔ بینک کے ذریعے ان کی وصولی اور اس پر بینک کے معاوضے کی شرعی حیثیت۔
 - ۳۔ میعاد پوری ہونے سے قبل ہنڈی پر بٹہ لگانے کا حکم۔
- ذیل میں بالترتیب ان کے جوابات ملاحظہ فرمائیں:
- ۱۔ لین دین کے وقت ان کی تحریر میں شرعا کوئی امر مافع نہیں بلکہ بعض حالات میں تحریر شریعت کا تقاضا ہے جیسا کہ پر مزری نوٹ کا معاملہ ہے۔ یہ اصل میں دین (Debt) کی دستاویز ہے جس کو لکھنے کا حکم قرآن نے دیا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَيْتُمْ بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ﴾

[البقرة: ۲۸۲]

”اے ایمان والو! جب تم آپس میں ایک مقررہ وقت تک ادھار کے ساتھ معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔“

ڈاکٹر علامہ عمر بن عبدالعزیز الحمرک رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

((فانه لا محذور شرعا في تحرير هذه الاوراق لانها اما وثيقة بدین

كما في السند الاذنی وتحريرها مطلوب شرعا للاستيثاق قال



تعالیٰ: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَيْتُمْ بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ﴾ [البقرة: ۲۸۲] واما حوالہ کما فی الکسبالیۃ، واما حوالہ و کالہ کما فی الشیک، فالأمر فیہ مودع والمصرف مدين والشخص الثالث اما محال علی مدين او موکل فی الاستيفاء لحقه وهذا مشروع فی الحمله))

”ان دستاویزات کی تحریر میں شرعاً کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ یہ یا تو قرض کی دستاویزات ہیں جیسا کہ پر مزی نوٹ ہے اطمینان کے لیے شرعاً اس کی تحریر کا مطالبہ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اے ایمان والو! جب تم آپس میں ایک مقررہ وقت تک ادھار کے ساتھ معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔﴾ کیا حوالہ ہے جیسا کہ ہنڈی ہے۔ یا حوالہ اور وکالہ ہے جیسا کہ چیک ہے اس میں حکم دینے والا ڈیپازٹر ہوتا ہے اور بینک کی حیثیت مقروض کی ہے۔ اور تیسرے شخص کی حیثیت یا تو محال یا حق کی وصولی کے لیے وکیل کی ہے اور یہ سب جائز ہیں۔“

البتہ جن صورتوں میں دونوں طرف سے نقد ہونا شرط ہے جیسے بیع صرف یعنی روپے کا ڈالر وغیرہ سے تبادلہ یا ایک طرف سے مجلس عقد میں مکمل ادائیگی ضروری ہو

”حوالہ شریعت کی ایک معروف اصطلاح ہے جس کا معنی ہے ”نقل دین من ذمۃ الی ذمۃ“ قرض کی ذمہ داری ایک شخص سے دوسرے کی طرف منتقل کرنا“ [فتح الباری: ۴/۵۸۵]

”یعنی مقروض خود قرض ادا کرنے کی بجائے قرض خواہ کو کسی دوسرے کے سپرد کر دے کہ اس سے وصول کر لینا“ اکثر کے نزدیک حوالہ صحیح ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ جس کے حوالے کیا جا رہا ہو وہ اس پر رضا مند ہو۔“ [فتح الباری: ۴/۵۸۵]

”اسی طرح حوالہ میں یہ بھی ضروری ہے کہ جس کے حوالے کیا جا رہا ہے اس کے ذمہ حوالہ کرنے والا کا اتنا قرض ضرور ہو جتنا اس کے ذمہ اس شخص کا ہے جس کو یہ حوالے کر رہا ہے۔ واضح رہے ہنڈی صرف ایک صورت میں حوالہ بنتی ہے وہ ہے جب ہنڈی کے وصول کنندہ نے مرتب کنندہ کو قرض دے رکھا ہو اور مرتب کنندہ اسے مرتب الیہ کے حوالے کرے کہ آپ اس سے وصول پالیں۔“



جیسے بیع سلم بیعہ ہے۔ وہاں ہنڈی کا استعمال درست نہیں۔

بینک کی وساطت سے وصولی کا حکم:

ان کی وصولی میں بینک کی خدمات حاصل کرنے اور اس کے بدلے بینک کو کمیشن دینے میں شرعاً کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں بینک وصول کنندہ کا وکیل ہوتا ہے۔ چنانچہ علامہ ڈاکٹر عمر بن عبدالعزیز المکترک رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

((هذه العملية ظاهر فيها الجواز شرعاً لان العمولة التي ياخذها المصرف هي اجرة او جعالة له على التحصيل وما يتطلبه من جهد ويتكلفه من مصاريف انتقال محصيله و ارسال الاخطارات لهم والاشعارات بسدادهم)) [الربا والمعاملات المصرفية: ص ۳۹۵]

”یہ کارروائی بظاہر شرعی طور پر جائز ہے کیونکہ بینک جو کمیشن لیتا ہے وہ وصولی کی خدمات سرانجام دینے کی اجرت یا حق محنت ہے۔ علاوہ ازیں وصولی کی کارروائی اور ادائیگی کے نوٹس وغیرہ بھیجنے پر اخراجات بھی آتے ہیں۔“

لہذا بینک کو اپنی خدمت کی اجرت اور اخراجات وصول کرنے کا حق ہے۔

ڈاکٹر علی احمد السالوس رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

((والبنك يتعامل في هذه الاوراق من حيث الحفظ والتحصيل لحساب المستفيد كوكيل عنه الوكالة هنا باجر، والعمولة التي يأخذ البنك يقابلها منفعة مشروعة، وخدمة تؤدي هذا من الاعمال المصرفية الجائزة شرعاً وما يؤخذ في نظيرها ليس من الربا))

[المعاملات المالية المعاصرة: ص: ۱۲۴]

”ان اوراق میں بینک کا کردار یہ ہے کہ وہ ان کی حفاظت کرتا ہے اور وصول کنندہ کے

بیعہ بیع سلم کا مفہوم یہ ہے کہ چیز کی قیمت پیشگی ادا کر دی جائے لیکن چیز بعد میں وصول پائی جائے اس میں مکمل قیمت پیشگی ادا کرنا لازمی شرط ہے۔“



ویکن کی حیثیت سے وصول کر کے اس کے ھٹاتے میں بیع کروانا ہے بینک کی یہ وکالت اجرت کے بدلے ہوتی ہے۔ چنانچہ بینک جو کمیشن لیتا ہے وہ ایک جائز فائدہ اور خدمت کا بدلہ ہے بینکاری امور میں یہ عمل شرعاً جائز ہے۔ اس کے مقابلے میں جو کمیشن لیا جاتا ہے وہ سود نہیں۔“

ایک شبہ کا ازالہ:

یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اگر بینک وکیل ہے تو مال بینک کے پاس ضائع ہونے کی صورت میں بینک پر کوئی تاوان نہیں ہونا چاہیے بشرطیکہ اس کی کوتاہی یا غفلت شامل نہ ہو لیکن یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے کہ بینک ہر صورت میں ضامن ہوتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بینک اجیر مشترک ہے جو متعدد لوگوں کی وکالت کا فرض سرانجام دیتا ہے اور مشترک نقصان کی صورت میں ذمہ دار ہوتا ہے۔ شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

شریعت میں اجیر (کارکن) دو قسم کے ہیں:

۱۔ اجیر خاص۔

۲۔ اجیر مشترک۔

مثلاً کسی نے ایک دھوبی خاص اپنے لیے نوکر رکھا ہوا ہے اور دوسری قسم یہ ہے کہ دھوبی بہت سے لوگوں کے کپڑے دھوتا ہے۔ قسم اول سے کوئی نقصان اس کی لا پرواہی یا بددیانتی کے بغیر ہو جائے تو اس پر تاوان نہیں ہوتا قسم دوم پر ہوتا ہے۔ [فتاویٰ ثنائیہ: ۲/ ۴۶۷]

ہنڈی بھنانے کا حکم:

جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے کہ ہنڈی بھناتے وقت بینک ایک خاص شرح کے مطابق کٹوتی بھی کرتا ہے جب کہ کمیشن اور ڈاک اخراجات اس کے علاوہ ہوتے ہیں۔ یہ کٹوتی اصل میں وہ سود ہوتا ہے جو بینک کو اس عرصہ میں اس رقم کے عوض حاصل ہونا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بٹہ لگانے کی شرح ہنڈی کی تاریخ ادائیگی کو سامنے رکھ کر مقرر کی جاتی ہے جوں تاریخ ادائیگی قریب آتی جاتی ہے یہ شرح کم ہوتی جاتی ہے۔ جب اس کا سود ہوتا



ثابت ہو گیا تو اس کے حرام ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں رہتا۔

چنانچہ ڈاکٹر علی احمد السالوس رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

((واسمواً أعمال البنك هنا اتخاذه الاوراق التجارية وسيلة

للاقراض الربوى و ذلك عن طريق ما يسمى بالخصم))

[المعاملات المالية المعاصرة، ص: ۱۲۴]

”یہاں بینک کا بدترین کردار کاروباری دستاویزات کو سودی قرض کا ذریعہ بنانا ہے اور

یہ ڈسکاؤنٹ کی صورت میں ہوتا ہے۔“

ڈاکٹر وہبہ زحلی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

((وهذه العملية حرام شرعاً لأنها قرض الربوى يتضمن فائدة ربوية

عن المدة المستقبلية و يدخل تحت مفهوم ربا النساء المحرم شرعاً

لان البنك يدفع الاقل ليقبض فى نظيره اكثر منه بعد اجل وهو امر

محظور شرعاً باتفاق الفقهاء لوجود الربا فيه)) [المعاملات المالية

المعاصرة، ص: ۲۳۳]

”عمل شرعی طور پر حرام ہے کیونکہ یہ سودی قرض ہے جو مستقبل کے عوض سودی فائدے

پر مشتمل ہے یہ ربا النسیئة کے مفہوم میں داخل ہے جو شرعاً حرام ہے۔ کیونکہ بینک

نے کم رقم دے کر کچھ مدت بعد اس کے عوض زیادہ حاصل کرنی ہے اس میں ربا کی

آمیزش ہونے کی وجہ سے فقہاء شرعی طور پر اس کے حرام ہونے پر متفق ہیں۔“

اسلامی فقہ اکیڈمی نے بھی ایک قرار داد (بمطابق ۱۹۹۲ء) میں اسے حرام قرار

دیا ہے۔ [حوالہ مذکورہ]

بعض شبہات کا ازالہ:

بعض حضرات یہ توجیہ کرتے ہیں کہ بینک اصل میں ہنڈی کے وصول کنندہ کا وکیل ہوتا

ہے جس نے ہنڈی کے مرتب الیہ سے رقم وصول پا کر اس کے سپرد کرنا ہوتی ہے۔



ڈسکاؤنٹ کے بعد بینک جو رقم دے رہا ہے وہ اصل میں بینک کی طرف سے وصول کنندہ کی خدمت میں قرض ہے جو اس نے ہنڈی کی وصولی پر واپس کرنا ہوتا ہے جب کہ ڈسکاؤنٹ کی رقم بینک کا حق محنت ہے یوں یہ دو مختلف معاملات بن جاتے ہیں۔

- ۱۔ ہنڈی کے وصول کنندہ کا بینک کو اجرت پر وکیل مقرر کرنا۔
 - ۲۔ بینک کا ہنڈی پر تحریر شدہ رقم کے مساوی قرضہ فراہم کرنا اور وصول کنندہ کا بینک کو وصول ہونے والی رقم سے اپنا قرض واپس لینے کا اختیار دینا۔
- شرعی طور پر یہ دونوں معاملے جائز ہیں۔ اجرت پر وکیل بنانا بھی اور مشروط اضافہ کے بغیر قرض دینا بھی۔ یوں اس میں کوئی خرابی نہیں رہتی۔

جواب:

بظاہر یہ توجیہ بڑی دلکش معلوم ہوتی ہے لیکن اگر تھوڑا سا غور کیا جائے تو اس کی کمزوری بالکل عیاں ہے۔

✽ ایک تو اس لیے کہ بینک جو کٹوتی کرتا ہے وہ ادائیگی کی مدت سے وابستہ ہوتی ہے اگر وہ زیادہ ہوگی تو کٹوتی کی شرح بھی زیادہ۔ اور اگر وہ مدت کم ہوگی تو کٹوتی کی شرح بھی کم جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے۔ اگر یہ حق محنت ہے تو دونوں صورتوں میں فرق کیوں؟ جب کہ حق محنت دونوں صورتوں میں برابر ہے کٹوتی کو ادائیگی کی مدت سے وابستہ کرنا اس کے سود ہونے کی بین دلیل ہے۔

✽ دوسرا اس لیے کہ بینک جو کٹوتی کرتا ہے وہ ادائیگی کی تاریخ آنے سے پہلے ہوتی ہے اس کا مطلب ہے کہ بینک نے ابھی تک کوئی خدمت سرانجام نہیں دی لیکن حق محنت وصول کر لیا ہے حالانکہ حق محنت کام پورا ہونے کے بعد دیا جاتا ہے۔

✽ تیسرا اس لیے کہ یہ قرض وکالت کے معاوضہ کی صورت میں اضافی فائدہ کا باعث بن رہا ہے اور جس قرض سے فائدہ حاصل ہو وہ سود کے زمرے میں آتا ہے۔

چنانچہ حضرت ابنی بن کعب رضی اللہ عنہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن



عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

((انہم نہوا عن قرض جر منفعة)) [ارواء الغلیل: ۲۳۴/۵]

”انہوں نے اس قرض سے منع کیا جو فائدے کا باعث بن رہا ہو۔“

دوسرا شبہ:

دوسری توجیہ یہ کی جاتی ہے کہ حامل دستاویز اصل میں بینک کو وہ دستاویز کم قیمت پر فروخت کرتا ہے یعنی جب ہزار کی ہنڈی کے بدلے ۹۵۰ وصول پاتا ہے تو گویا ایک ہزار کو ۹۵۰ کے عوض فروخت کیا اور یہ جائز ہے۔

جواب:

یہ صورت ”بیع الدین علی غیر من ہو علیہ“ ”اس شخص کے ساتھ ذین (قرض) کی بیع ہے جس پر دین نہیں ہے“ کہلاتی ہے۔ اگرچہ بعض فقہاء نے اس کو جائز قرار دیا ہے لیکن اس سے ہنڈی کے ڈسکاؤنٹ کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس میں سود کی دونوں قسمیں ربا الفضل اور ربا النسیئة پائی جاتی ہیں۔ وہ اس طرح کہ یہاں در حقیقت نقد کی نقد ساتھ بیع ہے جس میں کمی بیشی اور ادھار دونوں سود شمار ہوتے ہیں جب کہ یہاں دونوں چیزیں ہی پائی جا رہی ہوتی ہیں۔ اس لیے یہ جائز نہیں۔

تیسرا شبہ:

بعض حضرات کے خیال میں اگر مرتب الیہ بٹ لگانے والا بینک خود ہو تو اس کا مطلب ہوگا کہ قرض کی جلد ادائیگی کے بدلے اس کا کچھ حصہ چھوڑا جا رہا ہے۔ جیسا کہ سعودی کبار علماء کے بورڈ کی رائے ہے۔ [ابحاث ہیئۃ کبار العلماء: ۳۷۸/۵]

اس کو اصطلاح میں ضَعُ وَتَعَجَّلُ ”چھوڑ دو اور جلد وصول کرلو“ کہا جاتا ہے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما حضرت ابراہیم نخعی اور امام ابو ثور رحمہ اللہ کے نزدیک بھی یہ جائز ہے۔ [مصنف عبدالرزاق: باب الرجل یضع من حقہ و یتعجل، المغنی: ۱۰۹/۶]



حضرت عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب اور شیخ عبدالرحمن سعدی رحمۃ اللہ علیہ بھی اس کو جائز قرار دیتے ہیں۔ [ابحاث ہیئۃ کبار العلماء: ۵/۳۷۹]

علامہ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ [الربا والمعاملات المصرفیۃ: ص: ۳۹۲]

جواب:

لیکن درج ذیل وجوہ کے باعث یہ رائے درست معلوم نہیں ہوتی۔
 ❁ ان حضرات کے برعکس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تابعین عظام اور فقہاء محدثین کی غالب اکثریت ضعیف و تعجل کو ناجائز سمجھتی ہے۔ چنانچہ علامہ ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:
 ((کرہہ زید بن ثابت، وابن عمر، والسقداد، سعید بن المسیب، سالم، والحسن، وحماد، والحکم، والشافعی، ومالك، والثوری، وهشیم، وابن علیہ، واسحاق، وابو حنیفہ))

[المغنی: ۴/۱۰۹]

”حضرت زید بن ثابت، عبداللہ بن عمر، مقداد، سعید بن مسیب، سالم، حسن، حماد، حکم، شافعی، مالک، ثوری، ہشیم، ابن علیہ، اسحاق، ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس کو مکروہ سمجھتے ہیں۔“
 ابوصالح رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

((بَعَثْتُ بَرَّاءَ إِلَى مِنْ أَهْلِ دَارِ نَخْلَةَ إِلَى أَجَلٍ ثُمَّ أَرَدْتُ الْخُرُوجَ إِلَى الْكُوفَةِ فَعَرَضُوا عَلَيَّ أَنْ أَضَعَ عَنْهُمْ بَعْضَ الثَّمَنِ وَيَقْدُونِي فَسَأَلْتُ عَنْ ذَلِكَ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ فَقَالَ لَا أَمُرُّكَ أَنْ تَأْكُلَ هَذَا وَلَا تُؤْكِلَهُ))

[موطأ: کتاب البیوع، باب ما جاء فی الربا فی الدین]

”میں نے اہل نخلہ کو ادھار کپڑا فروخت کیا پھر میرا کوفہ جانے کا ارادہ بن گیا انہوں نے مجھے یہ پیشکش کی کہ میں کچھ قیمت کم کر دوں تو وہ باقی قیمت فوری ادا کر دیں گے۔ چنانچہ میں نے اس کے متعلق زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا



میں آپ کو یہ مشورہ نہیں دیتا کہ آپ اس کو کھائیں یا دوسرے کو کھلائیں۔“

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا:

((عَنْ الرَّجُلِ يَكُونُ لَهُ الدَّيْنُ عَلَى الرَّجُلِ إِلَى أَجَلٍ فَيَضَعُ عَنْهُ صَاحِبُ الْحَقِّ وَيُعَجِّلُهُ الْآخَرُ فَكِرَهُ ذَلِكَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عُمَرَ وَنَهَى عَنْهُ)) [موطا امام مالك: باب ما جاء في الربا في الدين]

”ایک آدمی نے دوسرے سے ایک عرصہ بعد قرض لینا ہے۔ صاحب حق کچھ چھوڑ دیتا ہے اور دوسرا جلد ادا کر دیتا ہے تو انہوں نے اس کو ناپسند فرمایا اور اس سے منع فرمایا۔“
حضرت معمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

((وَلَا أَعْلَمُ أَحَدًا قَبْلَنَا إِلَّا وَهُوَ يَكْرَهُه)) [مصنف عبدالرزاق: باب

الرجل يضع من حقه و يتعجل]

”ہم سے پہلے تمام لوگ اس کو مکروہ سمجھتے تھے۔“

امام مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((وَالْأَمْرُ الْمَكْرُوهُ الَّذِي لَا اخْتِلَافَ فِيهِ عِنْدَنَا أَنْ يَكُونَ لِلرَّجُلِ عَلَى

الرَّجُلِ الدَّيْنُ إِلَى أَجَلٍ فَيَضَعُ عَنْهُ الطَّالِبُ وَيُعَجِّلُهُ الْمَطْلُوبُ،

وَذَلِكَ عِنْدَنَا بِمَنْزِلَةِ الَّذِي يُؤْخَرُ دَيْنُهُ بَعْدَ مَحَلِّهِ عَنْ غَرِيمِهِ وَيَزِيدُهُ

الْغَرِيمُ فِي حَقِّهِ قَالَ: فَهَذَا الرِّبَا بَعِينُهُ لَا شَكَّ فِيهِ)) [موطا امام مالك:

باب ما جاء في الربا في الدين]

”وہ معاملہ جو مکروہ ہے جس میں ہمارے نزدیک کوئی اختلاف نہیں وہ یہ ہے کہ آدمی

نے دوسرے سے ادھار لینا ہو تو صاحب حق کچھ چھوڑ دے اور دوسرا جلد ادا کر دے یہ

ہمارے نزدیک ایسے ہی ہے جیسے کوئی ادائیگی کی تاریخ آنے کے بعد قرض میں تاخیر

کرے اور قرض خواہ اپنے حق میں اضافہ کر دے یہ بلاشبہ مبیہ سود ہے۔“

❁ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہنڈی کی ڈسکاؤنٹ پر ”ضع و تعجل“ کا اصول منطبق نہیں



ہوتا۔ کیونکہ ”ضع و تعجل“ میں جو رقم چھوڑی جاتی ہے اس کا انحصار قرض خواہ پر ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف ہنڈی میں ڈسکاؤنٹ کی شرح بینک طے کرتا ہے۔

❁ ”ضع و تعجل“ میں مدت کا خیال نہیں رکھا جاتا جب کہ ڈسکاؤنٹ کی شرح مدت سامنے رکھ کر طے کی جاتی ہے۔ لہذا اس کو ”ضع و تعجل“ کی بنیاد پر جائز قرار دینا درست نہیں۔



حقوق کی بیج

حق تالیف، حق ایجاد، رجسٹرڈ تجارتی نام و نشان کی خرید و فروخت اور پگڑی کا لین دین مالی معاملات کی وہ صورتیں ہیں جن کا قرآن و حدیث میں کوئی تذکرہ نہیں ملتا اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین عظام اور ائمہ حدیث و فقہ رضی اللہ عنہم سے ان کے متعلق کوئی نص مروی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مسائل خیر القرون سے کافی عرصہ بعد سامنے آئے۔ البتہ جن علماء کے دور میں یہ مسائل پیدا ہوئے انہوں نے کھل کر ان کے بارہ میں اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ ذیل میں ہم ہر ایک کی مختصر تاریخ، مفہوم اور قرآن و حدیث کی اصولی ہدایات کی روشنی میں ان کا شرعی حکم بیان کرتے ہیں۔

حق التالیف:

ہر مؤلف کو اپنی تالیف سے متعلق دو قسم کے حقوق حاصل ہوتے ہیں:

(۱) ادبی (۲) مالی

ادبی کا اطلاق اس غیر مالی اختیار پر ہوتا ہے جس سے مؤلف کو درج ذیل دائمی اور ابدی حقوق حاصل ہوتے ہیں۔

❁ تالیف صرف اسی طرف منسوب ہوگی، کوئی دوسرا اپنا نام استعمال نہیں کر سکتا حتیٰ کہ خود مؤلف کو بھی یہ اختیار نہیں کہ وہ اپنی فکری کاوش دوسرے کے نام سے شائع کرے کیونکہ یہ جھوٹ کے زمرہ میں آتا ہے۔

❁ یہ فیصلہ کرنا بھی مؤلف کا اختیار ہوگا کہ کتاب کب شائع کرنی ہے؟ اور طباعت کا معیار کیا ہوگا۔

❁ دوبارہ اشاعت کی صورت میں حک و اضافہ کرنا۔



✽ اگر کوئی شخص ان ادبی اور مالی حقوق پر ڈاکہ ڈالے تو اس کا دفاع کرنا مؤلف اور اس کے ورثاء کا حق ہے۔

✽ اشاعت کے بعد اگر مؤلف یہ سمجھے کہ یہ مضمون اس کی آراء کے مطابق نہیں یا اس کی شخصیت کو نقصان پہنچا سکتا ہے تو بازار سے کتاب واپس لینے کی نگرانی کرنا۔ ایسی صورت میں ناشر کے نقصان کی تلافی کرنا مؤلف کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

مالی حق کا مطلب ہے کہ کتاب کی اشاعت تقسیم یا دوسرے ذرائع مثلاً سی ڈی یا آڈیو کیسٹ کے ذریعے بیان کرنے سے جو فوائد حاصل ہوں گے وہ بھی مؤلف کا حق ہیں۔ بسا اوقات مؤلف یہ حق فروخت بھی کر دیتا ہے۔ یہی فروخت اس وقت ہمارے زیر بحث ہے کہ آیا ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں۔

حق التالیف کی تاریخ:

اول الذکر یعنی ادبی حق تو ہر دور میں معتبر رہا ہے۔ کسی کی فکری کاوش کو اپنی طرف منسوب کرنا ہمیشہ معیوب سمجھا جاتا رہا ہے۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((و كحیل اللصوص و السراق علی أخذ اموال الناس و هم انواع لا تحصى فمنهم السراق بأیدیهم ومنهم السراق بأقلامهم))

[اعلام الموقعین: ج ۳ ص ۱۰۷۶]

”حیلوں کے ذریعے لوگوں کا مال چرانے والوں کی بے شمار قسمیں ہیں۔ بعض ہاتھوں سے چوری کرتے ہیں بعض قلموں کے ذریعے لوگوں کا مال چراتے ہیں۔“

علماء نے اس موضوع پر مستقل کتابیں بھی لکھی ہیں جن میں امام سیوطی رحمہ اللہ کی کتاب ”الفارق بین المصنف و السارق“ بھی شامل ہے۔ مالی حق کی شروعات پندرہویں صدی عیسوی کے آخر میں یورپ سے ہوتی ہے اور یہی زمانہ پریس کی ایجاد کا ہے۔ اس کے حق میں اولین قانون ۱۷۰۹ء-۱۱ کو برطانیہ کے لارڈ ہاؤس نے پاس کیا پھر ۱۹۱۰ء-۱۲ کو ملکہ برطانیہ کے دستخطوں سے فکری کاوشوں کے تحفظ کا قانون جاری ہوا۔



۱۷۹۱ء اور ۱۷۹۳ء کو فرانس میں اس کے حق میں قوانین بنائے گئے۔ ۱۷۸۹ء کو امریکا کی ایک ریاست Massachusetts اور ۱۷۹۰ء میں مرکز کی سطح پر اس کے حق میں قانون سازی ہوئی۔ [حقوق الاختراع والتألیف فی الفقہ الاسلامی ص: ۳۳۴]

اسلامی ممالک میں اس کے حق میں پہلی مرتبہ قانون سازی ۱۹۱۰ء میں عہد عثمانی میں ہوئی۔ بین الاقوامی سطح پر اس کے متعلق پہلا معاہدہ سوئزرلینڈ کے دارالحکومت برن میں ۱۸۸۶ء میں ہوا۔ بعد میں مختلف کانفرنسوں میں اصلاحات ہوتی رہیں۔ اب تقریباً ہر ملک میں اس حق کو قانونی طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔

حق ایجاد:

کسی شخص کو نئی چیز ایجاد کرنے کے بدلے جو حقوق حاصل ہوتے ہیں ان کو حقوق ایجاد کہا جاتا ہے۔ جیسے یہ حق کہ

❁ وہ چیز اس کی ایجاد کردہ کہلائے گی۔ دوسرا شخص نہ تو اس کو اپنی جانب منسوب کر سکتا ہے اور نہ اس کی نقل تیار کر سکتا ہے۔

❁ اس کے مالی فوائد پر موجود اور پھر متعین مدت تک اس کے ورثاء کا حق ہوتا ہے۔

”اس کے حق میں اولین قانون ۱۷۷۲ء کو اٹلی میں بنا۔ ۱۷۲۳ء میں انگلینڈ ۱۷۹۱ء کو فرانس اور ۱۸۱۵ء کو جرمنی کی بعض ریاستوں میں اس کے حق میں قوانین بنائے گئے۔ البتہ پورے جرمنی میں اس کو قانونی تحفظ ۱۸۴۲ء کے بعد ملا۔ اسلامی ممالک میں اس کی تاریخ عثمانی دور سے شروع ہوتی ہے۔“ [حقوق الاختراع والتألیف فی الفقہ الاسلامی]

تجارتی نام اور علامات:

کسی کارخانہ کا وہ مخصوص نام جو اسے الگ شناخت دے اس کا تجارتی نام کہلاتا ہے۔ مصنوعات کی پہچان کے لیے مقرر کردہ مخصوص نشان کو تجارتی علامت (ٹریڈ مارک) کہا جاتا ہے۔ یہ متعلقہ تاجر کا حق شمار ہوتا ہے۔ قانوناً دوسرے کے لیے اس کا استعمال ممنوع

ہوتا ہے۔ متعلقہ تاجر اگر چاہے تو یہ نام فروخت بھی کر سکتا ہے۔ اس کا ابتدائی دور انقلاب فرانس کا نواں (۹) سال ہے جب پیرس کی اپلیٹ کورٹ نے یہ فیصلہ دیا کہ جب کوئی شخص دکان فروخت کرتا ہے تو اس میں مادی ملکیت کے ساتھ ساتھ معنوی ملکیت بھی شامل ہوگی۔

[المعاملات المالية المعاصرة فى الفقه الاسلامى للدكتور محمد عثمان شبير]

”معنوی“ سے مراد شہرت اور لوگوں کا اعتماد (Good will) ہے۔

معنوی حقوق کی بیع کا شرعی حکم:

ان حقوق کو حقوق معنویہ کہا جاتا ہے یعنی وہ اختیار جن کا تعلق مادی چیز سے نہ ہو ان کی بیع و شراء میں اختلاف ہے۔ علماء کا ایک گروہ اس کے جواز کا نفی دیتا ہے تو دوسرا عدم جواز کو ترجیح دیتا ہے جب کہ بعض کے نزدیک مؤلف کو یہ حق تو پہنچتا ہے کہ وہ اپنی تالیف یا ایجاد سے مالی فائدہ اٹھائے یا شراکت کی بنیاد پر کسی سرمایہ کار کو اپنے ساتھ شامل کرے لیکن ان حقوق کی بیع درست نہیں۔ ان کا استدلال اس بات سے ہے کہ بیع کا مطلب ہے ہر قسم کے ملکیتی حقوق مشتری کی طرف منتقل ہو جائیں اس طرح کہ وہ چیز اس کی طرف منسوب ہو جائے شرعاً یہ جائز نہیں کہ چیز ملکیت کسی اور کی ہو لیکن اس کی نسبت دوسرے کی طرف ہو کیونکہ یہ جھوٹ اور فراڈ ہے۔ اس استدلال کا جواب یہ دیا گیا ہے یہ تب منع ہے جب خریدار ایجاد یا تالیف کی نسبت اپنی طرف منسوب کرے اگر یہ ہو کہ کتاب لکھی تو فلاں نے ہے مگر یہ ملکیت فلاں کی ہے تو اس میں کوئی جھوٹ اور فراڈ نہیں ہے۔

اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ لوگ ہمیشہ سے اپنی کتب وقف اور ہدیہ کرتے رہے ہیں نام مؤلف کا ہی ہوتا تھا۔ متقدمین میں سے کسی نے اس کو ناجائز قرار نہیں دیا۔ [حقوق الاختراع والتالیف فى الفقه الاسلامى]

شیخ مکرم بن عبداللہ ابو زید رحمۃ اللہ علیہ نے قائلین اور مانعین کے دلائل بڑی تفصیل سے بیان فرمائے ہیں ذیل میں ہم ان کے حوالے سے فریقین کے بعض دلائل نقل کرتے ہیں۔



قائلین کے دلائل:

❁ یہ ان حقوق کی طرح ہیں جو انسان کو اپنے بدن، حواس اور جذبات سے متعلق تکوینی اور جبلی تصرفات کے بارہ میں حاصل ہیں۔

❁ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ أَحَقَّ مَا أَخَذْتُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا كِتَابُ اللَّهِ)) [صحیح بخاری: باب الشَّرْطُ فِي الرُّقِيَةِ بِقَطْعِ مِنَ الْغَنَمِ]

”سب سے زیادہ حق دار جس پر تم اجرت لو اللہ کی کتاب ہے“

جب قرآن کا معاوضہ لینا جائز ہے تو دوسری کتب کا بالاولیٰ جائز ہوگا۔

❁ نبی ﷺ نے قرآن کی تعلیم کو حق مہر مقرر کر کے ایک صحابی کا نکاح پڑھایا۔ جب قرآن

کی تعلیم مہر بن سکتی ہے تو اس کی نشر و اشاعت کا معاوضہ کیوں نہیں لیا جاسکتا؟

❁ رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ سے پوچھا گیا۔

((أَيُّ الْكَسْبِ أَطْيَبُ قَالَ عَمَلُ الرَّجُلِ بِيَدِهِ وَكُلُّ بَيْعٍ مَبْرُورٍ))

[مسند احمد: ۱۷۷۲۸]

”کون سی کمائی بہتر ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا انسان کا اپنے ہاتھ سے کمانا اور ہر

مہر و ربح۔“

❁ علمائے سلف سے بھی کتب کا معاوضہ لینا ثابت ہے۔ ابو نعیم اصفہانی رحمہ اللہ نے چار

(۴۰۰) سودینار لے کر اپنی کتاب الحلیۃ بیچی۔ یہ چار سودینار ورق اور لکھنے کی قیمت تو

نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح جب مختلف علاقوں کے حکمرانوں نے اپنے علماء کے ذریعے

علامہ ابن حجر رحمہ اللہ سے ان کی کتاب کے نسخے منگوائے تو انہوں نے تین سو (۳۰۰)

دینار وصول کر کے دیئے۔

❁ کتاب مصنف کی ملکیت ہوتی ہے لہذا اس کو ہر قسم کا اختیار ہے بہرہ کرے یا وقف

کرے یا فروخت۔



❁ حق تالیف حقوق مقررہ میں سے ہے نہ کہ حقوق مجردہ سے۔ کیونکہ حق مجردہ ہوتا ہے جس کو شارع نے دفع ضرر کے لئے مشروع قرار دیا ہو جیسے حق شفعہ۔

حق مقررہ ہوتا ہے شروع ہی سے حق دار کے لیے ثابت ہو اس قسم کے حق کا معاوضہ لیا جاسکتا ہے۔ حق تالیف اسی قبیل سے ہے۔

مانعین کے دلائل:

جو حضرات ان حقوق کی خرید و فروخت کے مخالف ہیں ان کے دلائل حسب ذیل ہیں:

❁ علم عبادت ہے، صنعت و تجارت نہیں اور عبادت کا معاوضہ درست نہیں۔

❁ اس سے کتمان علم لازم آتا ہے جو حرام ہے

❁ یہ حق مجرد ہے اور حق مجرد کا معاوضہ صحیح نہیں۔ [فقہ النوازل: ج ۲ ص ۱۷۱، ۱۸۲]

راجح رائے:

اگر فریقین کے دلائل کا تجزیہ کیا جائے تو قین وجوہ کے باعث ان لوگوں کی رائے

صائب معلوم ہوتی ہے جو اس کے حق میں ہیں:

۱۔ مانعین نے اپنی تائید میں جو دلائل ذکر کئے ہیں وہ اس ثبوت کے لیے کافی و شافی نہیں

ہیں مصنف اگر کتاب پر حقوق الطبع محفوظ ہیں لکھ دیتا ہے تو اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں

ہوتا کہ وہ علم چھپانا چاہتا ہے اس کا مقصد تو صرف ناشر کو اس بات کا پابند بنانا ہوتا ہے

کہ وہ تنہا ہی اس سے فائدہ نہ اٹھائے بلکہ مؤلف کا بھی خیال رکھے۔ مانعین کا یہ کہنا

بھی درست نہیں کہ یہ طاعت ہے نہ کہ تجارت اس لئے اس کا معاوضہ نہیں لیا

جاسکتا۔ کیونکہ طاعات کی اجرت کا ثبوت حدیث سے بھی ثابت ہے اور فقہاء سے

بھی۔ اس کو حق شفعہ پر بھی قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ حق شفعہ کا مقصد دوسرے کو ضرر

سے محفوظ رکھنا ہے جب کوئی یہ حق فروخت کرتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ

دوسرے کو بیچنے سے اس کا کوئی نقصان نہیں۔ لہذا اس کا معاوضہ لینا جائز نہیں۔ جب

کہ زیر بحث حق دفع ضرر کے لیے نہیں بلکہ فکری و عملی محنت کا عوض ہے۔



۲۔ جمہور فقہاء کے نزدیک مال کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے جس سے عام حالات میں فائدہ اٹھایا جائے، اس حق کے قابل انتفاع ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

۳۔ ٹریڈ مارک اور تجارتی نام رجسٹرڈ کروانے میں محنت کے علاوہ اچھا خاصہ سرمایہ بھی خرچ کیا جاتا ہے اس لیے ان کو فروخت کرنا جائز ہے۔ اسلامی فقہ اکیڈمی نے اپنے پانچویں اجلاس جو دس سے پندرہ دسمبر ۱۹۸۸ء کو کویت میں منعقد ہونے بھی اس کے حق میں رائے دی ہے۔ اجلاس کی قرارداد کے الفاظ یوں ہیں:

أو لا: الاسم التجاري والعنوان التجاري والعلامة التجارية والتأليف والاختراع والابتكار: هي حقوق خاصة لأصحابها وأصبح لها في العرف المعاصر قيمة مالية معتبرة لتمول الناس لها وهذه الحقوق يعتد بها شرعاً فلا يجوز الاعتداء عليها۔

ثانيا: - يجوز التصرف في الاسم التجاري أو العنوان التجاري أو العلامة التجارية ونقل أي منها بعوض مالي إذا انتفى الغرر والتدليس والغش باعتبار أن ذلك أصبح حقاً مالياً۔

ثالثاً: - حقوق التأليف والاختراع أو الابتكار مصنونة شرعاً وأصحابها حق التصرف فيها ولا يجوز الاعتداء عليها۔) [بحوالہ موسوعة القضاء

بإلفاقية المعاصرة للدكتور على أحمد سالوس ص: ۶۱۸، ۶۱۹]

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تجارتی نام، عنوان اور تجارتی علامت، حق تالیف اور ایجاد وہ حقوق ہیں جو اپنے مالکان کے لیے خاص ہیں۔ دور حاضر کے عرف میں ان کی ایک معتبر مالی قیمت ہے اس لیے ان حقوق کو مالی معاوضہ کے بدلے دوسرے کے نام منتقل کرنا جائز ہے بشرطیکہ غرر، تدلیس اور دھوکے سے پاک ہوں۔ لہذا ان کے مالکان کو ان میں تصرف کا حق ہے اور ان حقوق پر زیادتی نہیں ہو سکتی۔



پگڑی

پگڑی کا لین دین بھی ان مسائل میں سے ہے جن پر بڑے شہر میں عمل ہو رہا ہے۔ عربی میں پگڑی کے لئے ”خلو“ کا لفظ آیا ہے۔ جس کا معنی ہے خالی ہونا۔ علامہ زرقانی رحمہ اللہ نے اس کی عمومی تعریف یوں کی ہے:

((هو اسم لما يملكه دافع الدراهم من المنفعة التي دفع في مقابلتها الدراهم)) [الموسوعة الفقهية، المادة خلّو]

”درہم ادا کرنے والے کی زیر ملکیت وہ منفعت جس کے بدلے اس نے درہم ادا کیے ہوں۔“

پگڑی جس طرح ذاتی پراپرٹی میں ہوتی ہے اسی طرح وقف اور بیت المال کی اراضی میں بھی ہوتی ہے۔

اراضی وقف میں پگڑی کی صورتیں:

وہ منفعت جو وقف کے کرایہ دار نے ناظر وقف کو تعمیر کی غرض سے کچھ رقم ادا کر کے اس شرط پر حاصل کی ہوتی ہے کہ وہ وقف کی منفعت کے فیصد کے حساب سے ایک متعین حصہ مثلاً نصف یا ثلث کا مالک ہوگا اور باقی حصہ کا کرایہ ادا کرے گا۔

اراضی بیت المال میں پگڑی کی صورت:

سرکاری زمین کے کرایہ دار کا وہ حق جو اسے سرکاری زمین میں درخت لگانے، تعمیراتی کام کرنے یا مٹی ڈالنے کی وجہ سے زمین پر قبضہ باقی رکھنے کی صورت میں حاصل ہوتا ہے۔ بشرطیکہ اس زمین کے حقوق خزانے کو ادا کرتا رہے۔ [الموسوعة الفقهية]

مگر ہمارے پیش نظر یہاں صرف ذاتی پراپرٹی میں پگڑی کا حکم معلوم کرنا ہے۔

ذاتی پراپرٹی میں گپڑی کا مفہوم:

وہ ناقابل واپسی رقم جو دکان یا مکان کا مالک کرایہ دار سے ماہانہ کرایہ کے علاوہ ایک مشنت وصول کرتا ہے۔ اس کے بعد مالک برائے نام مالک رہ جاتا ہے وہ دکان وغیرہ میں کسی قسم کا تصرف نہیں کر سکتا۔ ملکیت نامہ رکھنے کے باوجود نہ دکان خالی کروا سکتا ہے اور نہ دوسرے کو کرایہ پر دے سکتا ہے تا وقتیکہ کرایہ دار اس پر آمادہ نہ ہو اور مالک مارکیٹ ریٹ کے مطابق کرایہ دار کو گپڑی ادا نہ کر دے۔

گپڑی کی صورت میں دکان یا مکان کی مرمت وغیرہ حتیٰ کہ اگر کسی وجہ سے دکان گر جائے اس کو دوبارہ تعمیر کرنا کرایہ دار کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اگر کرایہ دار چاہے تو گپڑی بیچ کر قبضہ دوسرے کے حوالے بھی کر سکتا ہے۔ اس صورت میں بعض دفعہ مالک سابق کرایہ دار سے گپڑی کا کچھ فیصد بھی وصول کرتا ہے۔ گپڑی کی صورت میں کرایہ مارکیٹ ریٹ سے کافی کم ہوتا ہے

گپڑی کا فائدہ:

اس میں مالک اور کرایہ دار ہر دو کا فائدہ ہے۔ کرایہ دار کا اس طرح کہ اس کو یہ اندیشہ نہیں رہتا کہ مالک جب چاہے گا دکان خالی کر دالے گا۔ مالک کا اس طرح کہ وہ خود کو کرایہ دار کی زیادتی سے محفوظ سمجھتا ہے کیونکہ وہ گپڑی کے نام پر ایک معقول رقم پہلے ہی وصول کر چکا ہوتا ہے جب کہ باقی کرایہ کی صورت میں وصول کر رہا ہوتا ہے۔

گپڑی کے مختلف نام:

عربی میں گپڑی کو عام طور پر ”الخلو“ کہا جاتا ہے۔ تاہم بعض ممالک میں دوسرے ناموں سے بھی معروف ہے۔ عراق میں اس کو ”السر قفلیة“ (فارسی لفظ) کہتے ہیں اس کا مفہوم یہ ہے کہ کرایہ دار معاوضہ لے کر دوسرے کے حق میں دستبردار ہو جائے۔

شام میں ”الفروغ“ کہتے ہیں یعنی خالی کروانا۔ خلو کے لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے۔



مصر میں ”المفتاح“ یا ”الزينة“ کہا جاتا ہے۔

مفتاح کا لغوی معنی ہے چابی۔ پگڑی ادا کرنے کے بعد کرایہ دار تصرف کا مالک بن جاتا ہے اس لیے مفتاح کا نام دیا گیا۔

زینة کا معنی ہے ”ڈیکوریشن“ پگڑی ادا کر کے کرایہ دار مستقل رہنے کے لیے دکان سجاتا ہے اس لیے الزينة کہا جاتا ہے۔

مغرب یعنی تونس، الجزائر وغیرہ میں ”الجلسة“ کے نام سے معروف ہے جس کا معنی ہے بیٹھنا۔ پگڑی کے بعد کرایہ دار کو رہائش کا مستقل حق مل جاتا ہے اس لیے ”الجلسة“ کا نام دیا جاتا ہے: [المعاملات المالية المعاصرة فى الفقه الاسلامى للدكتور محمد عثمان شبير]

پگڑی کی تاریخ و ارتقاء:

اگرچہ قرآن وحدیث اور ائمہ حدیث وفقہ کے دور میں پگڑی کا ذکر نہیں ملتا لیکن اس کا یہ معنی بھی نہیں کہ یہ عصر حاضر کی پیداوار ہے بلکہ اس کا تصور کئی صدیاں پرانا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر وہبہ زحیلہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں

((وَأَوَّلُ ظُهُورِ مَسْأَلَةِ الْخُلُوكَانَ فِي الْإِنْدَلَسِ فِي أَوَاخِرِ الْقُرْنِ
التَّاسِعِ الْهَجْرِيِّ فِي مَجَالِ عَقَارَاتِ الْإِوْقَافِ الَّتِي تَحْتَاجُ إِلَى تَرْمِيمٍ
وَإِصْلَاحٍ وَعَسَارَةِ وَبْنَاءٍ وَزِرَاعَةٍ وَاسْتِثْمَارٍ)) [المعاملات المالية
المعاصرة: ص ۵۶۱]

سب سے پہلے پگڑی کا آغاز نویں صدی ہجری میں اندلس میں اوقاف کی ان زمینوں سے ہوا جو ترمیم و اصلاح، عمارت و بناء اور زراعت و سرمایہ کاری کی متقاضی تھیں۔

دسویں صدی ہجری کے مالکی فقیہ ابو عبد اللہ محمد بن الحسن اللقانی (۹۵۸ تا ۱۰۳۷) کا اس موضوع پر ایک فتویٰ بھی ہے جس کے متعلق علامہ حموی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وان نوزع فيه وقد اشتهرت فتياه في المشارق والمغرب و تلقاها علماء عصره بالقبول و هبت عليها نسيمات الصبا والقبول))
 [غمز عيون البصائر في شرح الاشتباه والنظائر: ج ۲ ص ۱۷۳]
 ”اگرچہ اس کے متعلق ان سے اختلاف کیا گیا ہے لیکن ان کا فتویٰ مشرق و مغرب میں مقبول ہے اور اس دور کے علماء نے اسے قبولیت بخشی ہے اور اس پر شوق و قبولیت کی ہوا کے جھونکے چلے ہیں۔“

دسویں صدی ہجری کے نصف اول تک قاہرہ کی مارکیٹوں میں اس کا خاصا رواج ہو چکا تھا۔

چنانچہ علامہ ابن نجیم مصری رحمۃ اللہ علیہ رقم طراز ہیں:

((فأقول على اعتباره: ينبغي أن يفتى بأن مايقع في بعض أسواق القاهرة من خلو الحوانيت لازم ويصير الخلو في الحانوت حقاً له فلا يملك صاحب الحانوت اخراجه منها ولا اجارتهالغيره ولو كانت وقفاً)) [الاشتباه والنظائر مع غمز عيون البصائر: ج ۲ ص ۱۶۸]
 ”میں کہتا ہوں کہ عرف خاص کا اعتبار کر کے قاہرہ کے بعض بازاروں میں دکانوں میں رائج پگڑی کے جواز کا فتویٰ دینا چاہیے اور یہ فتویٰ دینا چاہیے کہ پگڑی کرایہ دار کا حق ہے۔ دکان کا مالک نہ تو اس کو نکال سکتا ہے اور نہ کسی دوسرے کو دے سکتا ہے خواہ وہ وقف ہی کیوں نہ ہو۔“

مزید لکھتے ہیں:

((و قد وقع في حوانيت الجمelon بالغورية أن السلطان الغوري لما بناها أسكنها للتجار بالخلو)) [ایضاً۔ ج ۲، ص ۱۶۸]
 ”سلطان غوری نے غوریہ میں جب جملون کی دکانیں تعمیر کیں تو تاجروں کو پگڑی پر دی تھیں۔“

پگڑی کا حکم:

پگڑی کی رقم کس چیز کا معاوضہ ہے، اس بارہ میں علماء کے مختلف نقطہ ہائے نظر ہیں درست رائے کے مطابق یہ درحقیقت مالک کے اس حق کا معاوضہ ہے جو اسے دکان خالی کروانے اور دوسرے کو کرایہ پر دینے کی صورت میں حاصل تھا۔ کرایہ دار پگڑی ادا کر کے یہ حق خرید لیتا ہے تاہم اس کا جواز اس امر پر موقوف ہے کہ آیا اس سے کسی شرعی اصول کی خلاف ورزی تو لازم نہیں آتی۔ ہمارے خیال میں درج ذیل وجوہ کے باعث اس کا جواز محل نظر ہے۔

❁ بنیادی طور پر یہ اجارہ کا معاہدہ ہے جس میں کرایہ پر دی ہوئی چیز کرایہ دار کے پاس امانت ہوتی ہے۔ نقصان کا ذمہ دار خود مالک ہوتا ہے بشرطیکہ اس میں کرایہ دار کی زیادتی یا معاہدے کی خلاف ورزی کا دخل نہ ہو۔ چنانچہ الموسوعة الفقهية میں ہے۔
(والدار المستأجر تـكون أمانة في يد المستأجر فلا يضمن
الابالتعدى أو المخالفة))

”کرایہ پر دیا ہوا گھر کرایہ دار کے پاس امانت ہوتا ہے وہ صرف زیادتی اور معاہدے کی خلاف ورزی کی صورت میں نقصان کا ذمہ دار ہوگا۔“

پگڑی میں اس بات کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ اسی طرح گھر کی ایسی مرمت جس سے رہائش میں خلل واقع ہوتا ہو وہ بھی مالک کی ذمہ داری ہوتی ہے جیسا کہ ”الموسوعة الفقهية“ میں ہے۔

((كما يلزم المـؤجر عمارة الدار اصلاح كل ما يخل بالسكنى فان
أبى حق المستأجر فسخ العقد الا اذا كان استأجرها على حالها))
”گھر کی تعمیر اور رہائش میں نخل نقصان کی اصلاح کرایہ پر دینے والے کی ذمہ داری ہے، اگر وہ انکار کرے تو کرایہ دار کو عقد فسخ کرنے کا حق ہے الا کہ انھوں نے اجارہ ہی اس حالت پر کیا ہو۔“



پگڑی کی صورت میں مالک بالکل بے تعلق ہو جاتا ہے کرایہ دار جانے اور مکان۔
بعض لوگ کہتے ہیں کہ مرمت وغیرہ کی ذمہ داری معاہدے میں شرط ہوتی ہے۔ اس کا
جواب یہ ہے کہ فقہاء کے نزدیک ایسی شرط سے اجارہ فاسد ہو جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ سرخسی
حنفی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

((فان اشترط المرممة على المستأجر فسدت الاجارة لان المرممة

على الآخر)) [المبسوط: ج ۱۵ ص ۱۵۷]

”اگر یہ شرط لگائے کہ مرمت کرایہ دار کی ذمہ داری ہوگی تو اجارہ فاسد ہو جائے گا

کیونکہ مرمت کرایہ پر دینے والے کی ذمہ داری ہے۔“

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا ایک آدمی اس شرط پر مکان کرایہ پر دیتا ہے کہ اس کی
لکڑی ٹوٹی یا گھر کو معمولی مرمت کی ضرورت پیش آئی تو یہ کرایہ دار کی ذمہ داری ہوگی؟ تو
انہوں نے فرمایا:

((لا خیر فی ذلك الا ان يشترط من كرائها)) [المدونة الكبرى:

ج ۱۱، ص ۵۰۹]

”اس میں کوئی خیر نہیں الا کہ ان اخراجات کو کرایے سے منہا کرنے کی شرط ہو تو
پھر جائز ہے۔“

✽ اجارہ کی مدت متعین ہونی چاہیے۔ الموسوعة الفقهية میں ہے۔

((وبیان المنفعة فی اجارة الدور ببيان المدة فقط))

”گھروں کے اجارہ میں منفعت کی وضاحت فقط اجارہ کی بیان کرنے سے ہوگی۔“

پگڑی میں اجارہ غیر محدود وقت کے لیے ہوتا ہے۔

بعض حضرات کے خیال میں یہاں مدت مجہول نہیں بلکہ یہ ابدی اجارہ ہے مگر اس پر
سوال پیدا ہوتا ہے کیا شریعت میں ابدی اجارہ کا تصور پایا جاتا ہے؟ فقہ حنبلی کی معروف
کتاب ”زاد المستنفع“ میں بیع کی تعریف میں ”على التأبید“ کے الفاظ ذکر ہوئے

ہیں۔ امام بہوتی رحمۃ اللہ علیہ اس کی شرح میں فرماتے ہیں:

((یشرح الاجارة)) [الروض المربع: ص ۲۷۵]

”یہ قید اجارہ کو بیع سے خارج کر رہی ہے۔“

یعنی بیع ابدی ہوتی ہے جبکہ اجارہ محدود مدت کے لیے۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

((وعلى واضعى القوانين الايجارية اعادة النظر مسألتي تأييد الاجارة
وتحميد الاجرة لان اجارة محدودة المدة وتعتمد على التراضى بين
المالك والمستأجر ولان تحميد الاجرة ينافى العدل)) [المعاملات
المالية المعاصرة: ص ۵۶۷]

”اجارہ کے قوانین وضع کرنے والوں پر لازم ہے کہ وہ ابدی اجارے اور اجرتِ منجمد کرنے کے مسئلہ پر نظر ثانی کریں کیونکہ اجارہ محدود مدت کے لیے ہوتا ہے مالک اور کرایہ دار کی رضا مندی پر منحصر ہوتا ہے اور اس لیے بھی کہ اجرتِ منجمد کرنا عدل کے منافی ہے۔“

تمام فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ درج ذیل صورتوں میں عقد اجارہ ختم ہو جاتا ہے۔

۱۔ مدت ختم ہو جائے۔

۲۔ اجارہ پردی ہوئی چیز تباہ ہو جائے۔

۳۔ اجارہ واپس کرنے کی صورت میں۔

چنانچہ الموسوعة الفقهية میں ہے:

((اتفق الفقهاء على ان الاجارة تنتهى بانتهاء المدة أو بهلاك
المعقود عليه المعين أو بالاقالة))

”فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ اجارہ مدت ختم ہونے یا اجارہ پردی ہوئی چیز تباہ ہو جانے یا اجارہ واپس کرنے کی صورت میں ختم ہو جاتا ہے۔“

پگڑی میں یہ بات نہیں ہوتی بلکہ اگر کسی وجہ سے دکان گر بھی جائے تو کرایہ دار کو کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے اور دکان کی دوبارہ تعمیر بھی اس کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

بعض کی رائے میں پگڑی سے مالک جائیداد اپنے حق تصرف سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ قائلین اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ مالک نے یہ شرط از خود قبول کی ہوتی ہے اور اس کا معاوضہ بھی وصول کیا ہوتا ہے۔

ملاحظہ:

بعض دفعہ مالک طے شدہ مدت سے پہلے ہی دکان خالی کروانا چاہتا ہے کرایہ دار اس وقت تک خالی کرنے کے تیار نہیں ہوتا جب تک مالک کچھ رقم ادا نہ کر دے اس کو بھی پگڑی کہہ دیتے ہیں۔ مگر یہ جائز ہے کیونکہ طے شدہ مدت تک وہاں رہنا کرایہ دار کا حق ہے جو سلب نہیں کیا جاسکتا۔ اگر مالک وقت سے پہلے قبضہ لینا چاہتا ہے تو کرایہ دار کے لیے اس حق کا معاوضہ لینا جائز ہے۔



بیع قسط

دور حاضر میں جن معاملات کو وسیع پیمانے پر فروغ حاصل ہوا ہے ان میں قسطوں پر خرید و فروخت بھی شامل ہے اس کو عربی میں ”البیع بالتقسيط“ کہا جاتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ چیز تو فوراً مشتری کے حوالے کر دی جائے مگر اس کی قیمت طے شدہ اقساط میں وصول کی جائے قسط کو نجم بھی کہتے ہیں۔ جس کا معنی ہے ”ستارہ“ شارح بخاری علامہ وحید الزماں رحمۃ اللہ علیہ اس کی وجہ تسمیہ میں فرماتے ہیں:

”عرب میں تمام معاملات تاروں کے طلوع پر ہوا کرتے تھے کیونکہ وہ حساب نہیں جانتے تھے وہ یوں کہتے تھے کہ جب فلاں تارہ نکلے گا تو یہ معاملہ ہوگا اسی وجہ سے قسط کو نجم کہنے لگے۔“ [تیسیر الباری: ج ۲، ص ۶۲۶]

بعض لوگ اس کو موجودہ دور کی ایجاد سمجھتے ہیں جو درست نہیں اس کا رواج تو عہد رسالت و صحابہ میں بھی موجود تھا جیسا کہ ذیل کے دو واقعات سے ثابت ہوتا ہے

پہلا واقعہ:

((عَنْ عَمْرِو بْنِ الشَّرِيدِ قَالَ وَقَفْتُ عَلَى سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ فَجَاءَ الْمِسُورِيُّ مَخْرَمَةً فَوَضَعَ يَدَهُ عَلَى إِحْدَى مَنْكِبَيْ إِذْ جَاءَ أَبُو رَافِعٍ مَوْلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا سَعْدُ إِنِّتَعِ مِنِّي بَيْتِي فِي دَارِكَ فَقَالَ سَعْدُ: وَاللَّهِ مَا أَتْبَعُهُمَا فَقَالَ الْمِسُورِيُّ: وَاللَّهِ لَتَبْتَاعَهُمَا فَقَالَ سَعْدُ: وَاللَّهِ لَا أَزِيدُكَ عَلَى أَرْبَعَةِ آلَافٍ مُنْجَمَةٍ أَوْ مُقْطَعَةٍ قَالَ أَبُو رَافِعٍ: لَقَدْ أُعْطِيتُ بِهَا خَمْسَ مِائَةِ دِينَارٍ وَلَوْ لَا أَنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: ((الْجَارُ أَحَقُّ بِسَقِيهِ)) مَا أُعْطِيتُكَهَا بِأَرْبَعَةِ آلَافٍ وَأَنَا أُعْطِ



بِهَآخْمُسَ مَائَةِ دِينَارٍ)) [صحيح بخارى: باب عرض الشفعة على صاحبها قبل البيع]

”عمر بن شريد کہتے ہیں کہ میں سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے پاس کھڑا تھا، اتنے میں مسور بن خرمہ آئے انھوں نے اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھا۔ اتنے میں نبی ﷺ کے غلام ابورافع آ گئے۔ انہوں نے کہا: اے سعد آپ کے محلے میں میرے جودو گھر ہیں وہ آپ خرید لیں۔ سعد نے کہا: اللہ کی قسم: میں نہیں خریدتا۔ حضرت مسور نے کہا کہ اللہ کی قسم آپ کو ضرور خریدنا ہوں گے۔ تب سعد نے کہا میں چار ہزار درہم سے زیادہ نہیں دوں گا وہ بھی قسطوں میں۔ ابورافع نے کہا کہ مجھے ان گھروں کے پانچ سو دینار (نقد) ملتے تھے اور اگر میں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے نہ سنا ہوتا کہ پڑوسی اپنے قرب کی وجہ سے زیادہ حق دار ہے تو میں آپ کو یہ گھر چار ہزار درہم میں بھی نہ دیتا۔ جب کہ مجھے ان کے پانچ سو دینار (نقد) ملتے تھے۔“

دوسرا واقعہ:

((قَالَ عُرْوَةُ: قَالَ لَتْ عَائِشَةُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا إِنَّ بَرِيرَةَ دَخَلَتْ عَلَيْهَا تَسْتَعِينُهَا فِي كِتَابَتِهَا وَعَلَيْهَا خُمُسَةُ أَوَاقٍ نُحِمْتُ عَلَيْهَا فِي خُمُسِ سِنِينَ))

[صحيح بخارى: كتاب المكاتب]

”عروہ کا بیان ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: بریرہ رضی اللہ عنہا ان کے پاس اپنی مکاتب میں مدد کے سلسلے میں حاضر ہوئی اس کے ذمہ پانچ اوقیہ چاندی تھی جو اس نے پانچ سالانہ اقساط میں ادا کرنا تھی۔“

امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں اس پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے:

((باب المكاتب ونجومه في كل سنة نجم))

”مکاتب اور اس کی قسطوں کا بیان ہر سال میں ایک قسط۔“

بیع قسط چونکہ بیع مَوَجل ہی کی ایک شکل ہے۔ جس میں چیز کی قیمت بیک مشت ادا

کرنے کی بجائے اقساط مقرر کر دی جاتی ہیں۔ اس لے ہمارے فقہاء نے اس کو الگ عنوان میں ذکر کرنے کی بجائے عموماً بیع مؤجل کے ضمن میں ہی بیان کیا ہے۔

قسطوں پر خریداری کی مختلف صورتیں:

ادھار یا قسطوں پر خریداری کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ نقد اور ادھار دونوں صورتوں میں ایک ہی قیمت ہو۔ ایسا شاذ و نادر ہوتا ہے تاہم اس کے جواز میں کوئی کلام نہیں۔

۲۔ ادھار میں نقد سے زیادہ قیمت وصول کی جائے۔ مثلاً یوں کہا جائے کہ یہ چیز نقد سو روپے کی اور ادھار ایک سو دس کی ہوگی۔ اس کے بارہ میں تین نقطہ نظر ہیں۔

(۱) جمہور فقہاء و محدثین رحمہم اللہ کی رائے میں یہ جائز ہے۔

چنانچہ امام شوکانی رحمہم اللہ فرماتے ہیں:

((وَقَالَتُ الشَّافِعِيَّةُ وَالْحَنَفِيَّةُ وَزَيْدُ بْنُ عَلِيٍّ وَالْمُؤَيَّدُ بِاللَّهِ وَالْحَمْهُورُ إِنَّهُ يَجُوزُ)) [نیل الاوطار: ج ۸، ص ۲۰۱]

”شافعیہ، حنفیہ، زید بن علی، مؤید باللہ اور جمہور اس کے جواز کے قائل ہیں“

اہل حدیث علماء میں سے سید میاں نذیر حسین محدث دہلوی، نواب صدیق حسن خان اور حافظ عبد اللہ محدث روپڑی رحمہم اللہ بھی اس کو جائز قرار دیتے ہیں۔ [فتاویٰ نذیریہ:

ج ۲، ص ۱۶۲۔ الروضة النديہ: ج ۲، ص ۸۹۔ فتاویٰ اہل حدیث: ج ۲، ص ۲۶۳، ۲۶۴]

سعودی عرب کے سابق مفتی اعظم شیخ ابن باز رحمہم اللہ بھی اس کے جواز کے حامی

ہیں چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

”قسطوں کی بیع میں کوئی حرج نہیں جب کہ مدت اور قسطیں معلوم ہوں خواہ قسطوں کی

صورت میں قیمت نقد قیمت سے زیادہ ہو کیونکہ قسطوں کی صورت میں بائع اور مشتری

دونوں فائدہ اٹھاتے ہیں۔ بائع زیادہ قیمت سے اور مشتری مہلت سے فائدہ

اٹھاتا ہے۔“ [فتاویٰ اسلامیہ: ج ۲، ص ۴۴۵]

اسلامی فقہ اکیڈمی جده نے بھی اپنے چھٹے اور ساتویں اجلاس میں جو بالترتیب سترہ تا تیس شعبان ۱۴۱۰ھ اور سات سے بارہ ذیقعدہ ۱۴۱۲ھ کو جده میں ہوئے اس کو جائز قرار دیا ہے۔ چھٹے اجلاس کی قرارداد کے متعلقہ الفاظ یہ ہیں:

((تجاوز الزيادة في الثمن المؤجل عن الثمن الحال كما يجوز ذكر ثمن المبيع نقداً و ثمنه بالاقساط بمدة معلومة)) (مو سوعة القضايا الفقهية المعاصرة و الاقتصاد الاسلامي للدكتور علي احمد سالوس)

”ادھار میں نقد سے زیادہ قیمت جائز ہے۔ جس طرح چیز کی قیمت نقد اور متعینہ اقساط میں ذکر کرنا جائز ہے۔“

ساتویں اجلاس کے الفاظ یوں ہیں:

((البيع بالتقسيط جائز شرعاً ولو زاد فيه ثمن المؤجل على المعجل)) (ایضاً)

”بیع قطع شرطاً جائز ہے خواہ اس میں ادھار قیمت نقد سے زیادہ ہو۔“

(۲) امام ابن حزم، امام ابن سیرین اور زین العابدین عدم جواز کے قائل ہیں۔

محدث البانی رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی نقطہ نظر کے حامی ہیں۔ [سلسلة الاحادیث الصحيحة: ج ۵]

(۳) حضرات طاؤس، ثوری، اور اوزاعی کی رائے میں یہ ہے تو ناجائز لیکن اگر بائع اس طرح سودا ہونے کے بعد دو قیمتوں میں سے کم یعنی نقد والی قیمت وصول کرے تو جائز ورنہ

ناجائز۔ [سلسلة الاحادیث الصحيحة: ج ۵]

قائلین جواز کے دلائل:

جو حضرات اس کے حق میں ہیں ان کا استدلال ایک تو اس بات سے ہے کہ معاملات میں اصل اباحت ہے۔ یعنی کاروبار کی ہر وہ صورت جائز ہے جس سے شریعت نے منع نہ کیا ہو۔ قرآن حکیم کی آیت: ﴿وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ﴾ ”اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال کیا ہے“ سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ سوائے ان بیوع کے جن کی حرمت قرآن و حدیث میں واضح کر دی

گئی ہے، ہر قسم کی بیع جائز ہے، اور قرآن و حدیث میں کوئی ایسی نص موجود نہیں جس سے اس کی ممانعت ثابت ہوتی ہو۔ ان حضرات کی دوسری دلیل ذیل کا واقعہ ہے:

((عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمَرَهُ أَنْ يُجَهِّزَ جَيْشًا فَتَفِدَّتِ الْإِبِلُ فَأَمَرَهُ أَنْ يَأْخُذَ فِي قِلَاصِ الصَّدَقَةِ فَكَانَ يَأْخُذُ الْبُعِيرَ بِالْبُعَيْرَيْنِ إِلَى إِبِلِ الصَّدَقَةِ)) [سنن ابی داؤد کتاب البیوع : باب فی الرخصة فی ذلك]

”حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ان کو جیش تیار کرنے کا حکم دیا تو اونٹ کم پڑ گئے، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ صدقے کے اونٹ آنے تک ادھار لے لو۔ تو انہوں نے لوگوں سے اس شرط پر اونٹ لیے کہ جب صدقے کے اونٹ آئیں گے تو ایک کے بدلے دو دو دیئے جائیں گے۔“

مانعین کے دلائل:

جو حضرات اس کی ممانعت کے قائل ہیں ان کی پہلی دلیل یہ ہے:

❁ ادھار کی صورت میں اضافی رقم اصل میں مدت کا معاوضہ ہے اور مدت کا معاوضہ لینا سود ہے۔

❁ اس رائے کے حق میں دوسری دلیل وہ روایات ہیں جن میں ایک بیع میں دو بیعوں کی ممانعت بیان ہوئی ہے۔ مثلاً:

((نَهَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعَتَيْنِ فِي بَيْعَةٍ))

[ترمذی: کتاب البیوع، باب مَا جَاءَ فِي النَّهْيِ عَنْ بَيْعَتَيْنِ فِي بَيْعَةٍ]

”رسول اللہ ﷺ نے ایک بیع میں دو بیعوں سے منع کیا ہے۔“

((نَهَى رَسُولُ اللَّهِ -صلى الله عليه وسلم- عَنْ صَفْقَتَيْنِ فِي صَفْقَةٍ

وَاحِدَةٍ)) [مسند احمد بن حنبل: ج ۸، ص ۳۸۳]

”رسول اللہ ﷺ نے ایک سودے میں دو سودوں سے منع کیا ہے۔“

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ انسان یہ کہے:

((وان كان بنقد فبكذا وان كان بنسيئة فبكذا)) [مصنف ابن ابی

شيبه: ج ۵ ص ۵۴]

“اگر نقد ہو تو اتنے کی اور ادھار ہو تو اتنے کی۔“

رائع نقطہ نظر:

ہمارے خیال میں حسب ذیل وجوہ کے باعث ان لوگوں کی رائے زیادہ وزنی ہے جو جواز کے حق میں ہیں۔

❁ ادھار کی صورت میں اضافے کا جواز خود قرآن کی آیت ﴿وَاحْلَ اللَّهُ الْبَيْع﴾ سے ثابت ہے۔ کیونکہ یہ آیت ان لوگوں کے رد میں نازل ہوئی ہے جیسا کہ ابن جریر طبری، علامہ ابن العربی، اور امام رازی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔ جن کا اعتراض یہ تھا کہ جب عقد بیع کے وقت ادھار کی زیادہ قیمت مقرر کی جاسکتی ہے تو پھر وقت پر ادائیگی نہ کرنے کی صورت میں اضافہ کیوں نہیں کیا جاسکتا۔ وہ کہتے دونوں صورتیں یکساں ہیں۔ چنانچہ رئیس المفسرین امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

((وذلك أن الذين كانوا يأكلون من الربا من أهل الجاهلية، كان إذا حلّ مالٌ أحدهم على غريمه، يقول الغريم لغريم الحق زدني في الأجل وأزيدك في مالك فكان يقال لهما إذا فعلا ذلك هذا ربا لا يحل فإذا قيل لهما ذلك فلا سواء علينا زدنا في أول البيع، أو عند مَجْلِ المال فكذلكهم الله في قيلهم)) [تفسير طبري]

”اہل جاہلیت میں سے جو لوگ سود کھاتے تھے، اس کی صورت یہ ہوتی کہ جب کسی کا دوسرے کے ذمے مال ہوتا جس کی ادائیگی کا وقت آچکا ہوتا وہ صاحب حق سے کہتا آپ مدت میں اضافہ کر دیں میں آپ کے مال میں اضافہ کرتا ہوں۔ جب ان سے کہا جاتا کہ یہ تو سود ہے جو حلال نہیں تو کہتے کہ ہم بیع کے آغاز میں اضافہ کریں یا مدت

پوری ہونے پر، دونوں صورتیں یکساں ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید فرمائی۔“
مشہور محدث و مفسر علامہ ابن العربی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

((وكانت تقول انما البيع مثل الربا اي انما الزيادة عند حلول الاجل آخرأ مثل اصل الثمن من اول العقد ورد الله عليهم قولهم)) [احکام القرآن]

”اہل جاہلیت کہتے تھے بیع سود کی مثل ہی ہے یعنی مدت پوری ہونے پر جو اضافہ کیا جاتا ہے وہ شروع عقد میں اصل قیمت میں اضافہ کی مانند ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اس قول کا رد فرمایا ہے۔“
امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((القوم كانوا فى تحليل الربا على هذه الشبهة وهى ان من اشترى ثوبا بعشرة ثم باع باحد عشر فهذا حلال فكذا اذا باع العشرة باحد عشر يحب ان يكون حلال لانه لا فرق فى العقل بين الامرین فهذا فى ربا النقد واما فى ربا النسيئة فكذلك ايضا لانه لو باع الثوب الذى يساوى عشرة فى الحال باحد عشر الى شهر جاز فكذا اذا اعطى العشرة باحد عشر الى شهر وجب ان يجوز لانه لا فرق فى العقل بين الصورتين)) [التفسير الكبير]

”ربا کو حلال قرار دینے کے متعلق لوگوں کا شبہ یہ تھا کہ جب کوئی شخص ایک کپڑا دس کا خرید کر گیارہ کا بیچے تو یہ جائز ہے اسی طرح جب دس (درہم) گیارہ کے بیچے تو معاملہ بھی جائز ہونا چاہیے۔ کیونکہ دونوں صورتوں میں عملاً کوئی فرق نہیں ہے یہ شبہ تو ربا نقد کے متعلق تھا۔“ ربا النسيئة کے بارے میں یہ شبہ تھا کہ وہ کپڑا جس کی نقد قیمت دس (درہم) ہے اگر وہ ایک مہینہ کے ادھار پر گیارہ کا بیچے تو یہ جائز ہے اسی طرح اگر دس (درہم) دے کر مہینے بعد گیارہ لے تو یہ بھی جائز ہونا چاہیے کیونکہ عقلی اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔“

ان جلیل القدر ائمہ تفسیر کے بیان سے ثابت ہوا کہ اہل جاہلیت کی اصل غلطی یہ تھی کہ وہ وقت پر ادائیگی نہ کرنے کی صورت میں اصل دین پر اضافہ کو ادھار کی صورت میں زیادہ قیمت لینے پر قیاس کرتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کا رد کرتے ہوئے فرمایا، ادھار کی صورت میں قیمت میں اضافہ کرنا بیع میں شامل ہے جو جائز ہے جبکہ بروقت ادائیگی نہ کر نیکی صورت میں اضافہ سود ہے جو حرام ہے

✽ ہر مدت کا معاوضہ سود نہیں ہوتا۔ مہلت کا اضافہ تب سود بنتا ہے جب انسان کے ذمہ قرض، دین (Debt) کی تاخیر یا اموال ربویہ کے تبادلے کی صورت میں ہو۔ نبی ﷺ نے سونے کے سونے کے ساتھ تبادلے میں دو شرطیں لگائیں ہیں:

۱۔ برابر برابر ہو۔

۲۔ دونوں جانب سے نقد ہو۔

اگر اسلام میں مدت کی قیمت کا اعتبار نہ ہوتا تو دونوں طرف سے نقد کی قید لگانے کی ضرورت نہ تھی۔ نیز ادھار کی صورت میں اضافہ بیع کے ضمن میں ہے اس لیے جائز ہے۔ فقہاء کرام نے بیع کے ضمن میں مدت کے اضافہ کو جائز قرار دیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: ”المعاملات المالية المعاصرة: للدكتور وهبة زحيلي حفظه الله۔“

✽ یہ اضافہ ربا کی کسی قسم میں شامل نہیں۔ اس کا اقرار ان لوگوں کو بھی ہے جو اس کے مخالف ہیں۔ چنانچہ مفتی سیاح الدین کا کاخیل رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

”ادھار کی وجہ سے جو ثمن میں اضافہ کیا جاتا ہے اس کو عین ربا اور ربا حقیقی کی طرح حرام نہیں کہا جاسکتا کیونکہ فقہاء کرام اور حضرات مفسرین نے حقیقی ربا کی جو تعریف کی ہے اس کے مطابق یہ ربا کی تعریف میں داخل نہیں ہے۔ [حکمت قرآن: جنوری ۱۹۹۲ء، ص ۱۴]

مزید لکھتے ہیں:

”سود سے اس کا فرق دو وجہوں سے ہے۔ ایک تو یہ دین پر اضافہ نہیں بلکہ شروع ہی

سے ٹمن مہنگا بتلادینا ہے وہ اضافہ محض اس کے ذہن میں ہے نیز مدت کے بڑھنے کے ساتھ اس زیادتی میں اضافہ نہیں ہوتا۔“ [ماہنامہ حکمت قرآن: جنوری ۱۹۹۲ء، ص ۱۶]

✽ محدثین کرام اور فقہاء عظام نے ”بیعتین فی بیعة“ کے مختلف مفاہیم بیان کیے ہیں۔

✽ بائع یہ کہے کہ یہ کپڑا نقد اس کا اور ادھار بیس کا۔ مشتری کسی ایک قیمت کا تعین کئے بغیر خرید لے۔

✽ یہ کہا جائے کہ میں اپنا گھر تجھے اتنے میں بیچتا ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ آپ نے اپنا غلام اتنے میں مجھے بیچنا ہے۔

✽ انسان کسی چیز کا سودا کرے مثلاً ایک تفسیر گندم کا اور اس کی قیمت پیشگی ادا کر دے۔ گندم کی ادائیگی کیلئے ایک مہینہ مدت مقرر ہو جائے۔ جب مقررہ وقت آئے تو فروخت کنندہ کہے کہ وہ گندم آپ مجھے دو مہینے کی مدت کے لے دو تفسیر کے عوض فروخت کرویں۔ [تحفة الاحوذی]

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس سے بیع عینہ مراد ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

((وفی السنن عن النبی ﷺ انه قال ((من باع بیعتین فی بیعة، فله

او کسھا او الربا)) و فیہ ایضا عن النبی ﷺ انه قال اذا تبايعتم بالعینة

و اتبعتم اذئاب البقر وترکتھم الجھاد فی سبیل اللہ ارسل اللہ علیکم

ذلا لا یرفعہ عنکم حتی ترجعوا الی دینکم و هذا کله فی بیعة

العینة وهو بیعتان فی بیعة)) [مجموع فتاوی: ج: ۲۹ ص ۴۳۲]

من باع بیعتین اور اذا تبايعتم بالعینة یہ سب بیع عینہ کے متعلق ہیں اور یہی

ایک بیع میں دو بیعتیں کرنے کا معنی ہے۔

پہلی صورت کے ناجائز ہونے کی علت قیمت کا متعین نہ ہونا ہے۔ دوسری صورت میں

بیع کو مستقبل کی شرط پر معلق کیا گیا ہے، اور آخری دو صورتوں میں ربا لازم آتا ہے جبکہ بیع تقسیط ان سب سے الگ ہے۔

✽ مانعین کا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی تشریح سے استدلال درست نہیں کیونکہ اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ ان کی مراد یہ ہو کہ مشتری ایک قیمت طے کئے بغیر چیز اٹھا کر لے جائے احتمال کی صورت میں جمہور کی تشریح ہی معتبر ہوگی۔ جنہوں نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ مشتری نقد یا ادھار کی صراحت کیے بغیر چیز اٹھا کر لے جائے۔

ملاحظہ:

یہاں یہ بھی واضح رہے کہ یہ جواز صرف اس وقت ہے جب ادائیگی میں تاخیر پر اضافی رقم خواہ وہ جرمانہ کے نام پر ہو وصول نہ کی جائے۔

دونوں صورتوں میں فرق ہے۔ پہلی صورت میں جب چیز ایک قیمت طے ہو جاتی ہے تو پھر اس میں اضافہ ممکن نہیں ہوتا خواہ ادائیگی مدت مقررہ پر کی جائے یا تاخیر کر کے۔

دوسری صورت میں فریقین کے درمیان طے ہونے کے بعد تاخیر پر جرمانہ وصول کیا جاتا ہے۔ جو زمانہ جاہلیت کے سود 'امسا تقضی و امان تربی' یا ادا کرو یا اضافہ کرو میں داخل ہے جو سراسر ناجائز ہے۔

ہمارے ہاں چونکہ قسطوں کی خرید و فروخت میں عموماً تاخیر پر جرمانہ عائد کیا جاتا ہے لہذا اس کو مطلق جائز قرار دینا درست نہیں ہے۔

خلاصہ

✽ کریڈٹ اور چارج کارڈز سودی ہیں لہذا ان کا استعمال حرام ہے۔

✽ ڈیبٹ کارڈ کے استعمال میں کوئی حرج نہیں۔

✽ کمرشل انشورنس کی تمام قسمیں ناجائز ہیں۔

✽ روایتی بینکوں میں رائج لیزنگ سودی معاملہ ہے۔

❁ شاک مارکیٹ میں بیع کی سادہ صورت میں شیئرز کا لین دین درست ہے مگر فیوچر سیل اور بدلہ جائز نہیں۔

❁ لین دین میں ہندی، پرومیری نوٹ اور چیک کے استعمال میں شرعاً کوئی خرابی نہیں سوائے ان مواقع کے جہاں دونوں یا ایک جانب سے نقد ہونا شرط ہے۔

❁ بینک کے ذریعے ان کی وصولی اور اس پر معاوضہ دینا بھی جائز ہے۔

❁ جلد وصولی کی غرض سے بٹہ لگوانا سود میں شامل ہیں

❁ پگڑی اجارہ قوانین کے خلاف ہے لہذا یہ درست نہیں۔

❁ ادھار میں نقد سے زیادہ قیمت لگائی جاسکتی ہے۔

❁ اکثر محدثین عظام نے ایک بیع میں دو بیع کی جو تشریح کی ہے بیع قسط اس میں شامل نہیں۔

❁ ادائیگی میں تاخیر پر جرمانہ عائد کرنا سود ہے۔



اسلامی بینکاری کی حقیقت!

تمہید:

گزشتہ چند سالوں کے دوران اسلامی بینک کاری نے غیر معمولی ترقی کی ہے اس وقت دنیا کے تقریباً ۵۷ ممالک میں اسلامی بینک کام کر رہے ہیں ان میں بعض غیر مسلم ممالک بھی شامل ہیں۔ صرف پاکستان میں مختلف بینکوں کی تین سو سے زائد برانچوں میں اسلامی بینکاری کے نام پر کام ہو رہا ہے۔ ان میں سے بعض بینک تو مکمل طور پر اسلامی بینک کہلاتے ہیں جیسے میزان بینک، البرکہ بینک، بینک اسلامی پاکستان اور دبئی اسلامی بینک وغیرہ۔ جبکہ بعض بنیادی طور پر تو سودی ہیں مگر ان میں اسلامی بینکاری کا شعبہ بھی قائم ہے اسلامی بینکاری کے حامی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ نظام نہ صرف کامیابی سے چل رہا ہے بلکہ تیز رفتاری سے ترقی کی منازل طے کر رہا ہے۔ اور سرمایہ کاروں کی بڑی تعداد اس جانب راغب ہو رہی ہے۔ عام لوگوں کا اعتماد بھی بڑھ رہا ہے۔ جبکہ دوسری طرف علوم دینیہ کے ماہر علماء کی غالب اکثریت کے نزدیک یہ ایک مشکوک معاملہ ہے۔ بلکہ بعض حضرات تو اسکو اسلام کے نام پر دھوکا اور فراڈ قرار دیتے ہیں ان کی رائے میں یہ اصل میں سراسر سودی نظام ہے کیونکہ عملاً دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے سوائے اسکے کہ اسلامی بینک شرعی اصطلاحات مراہجہ، اجارہ اور مشارکہ وغیرہ استعمال کرتے ہیں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسلامی بینکاری ایک سازش ہے جس کا مقصد ان لوگوں کی دولت سے فائدہ اٹھانا ہے جو سود سے نفرت کرتے ہیں اور وہ اپنے اس عقیدہ کی بنیاد پر روایتی بینکوں کے ساتھ کوئی معاملہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

اسلامی بینکوں پر تنقید کی وجوہ:

ہمارے خیال میں اسلامی بینکنگ پر ہونے والی اس تنقید کے پیچھے یہ سوچ ہرگز نہیں ہے کہ ہماری معیشت کے لیے سودی نظام ناگزیر ہے یا اس جدید دور میں شرعی احکام قابل عمل نہیں رہے ”نعوذ باللہ من ذلك“ بلکہ یہ شکوک و شبہات خود اسلامی بینک کاری کی عملی تطبیق کے پیدا کردہ ہیں۔ ذیل میں اس کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔

اسلامی بینکوں میں رائج اجارہ کا مقصد تمويل (فنانسنگ) ہے نہ کہ حقیقی اجارہ:

✽ اسلامی بینکوں میں رائج معاملات جیسے اجارہ، مشارکہ متناقصہ وغیرہ سے بینک کی اصل غرض لوگوں کی مالی ضرورتیں پوری کر کے فائدہ اٹھانا ہے۔ حقیقی اجارہ یا شراکت کا ارادہ نہیں ہوتا۔ جہاں اجارہ اور شراکت کے نام پر صرف فنانسنگ کے ذریعے فائدہ حاصل کرنا مقصود ہو وہ معاملہ جائز نہیں ہوتا کیونکہ معاملات میں مقصد کو دیکھا جاتا ہے نہ کہ الفاظ کو چنانچہ نبی ﷺ کا فرمان ہے:

((إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ ، وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوَى)) [صحیح بخاری :

باب کیف كان بدء الوحي]

”اعمال نیتوں پر موقوف ہیں اور ہر شخص کے لیے وہی ہوگا جس کی اس نے نیت کی۔“

قانون اسلامی کا معروف قاعدہ ہے

((العبرة في العقود للمقاصد والمعاني لا للالفاظ))

”عقود (Contracts) میں مقاصد اور معانی کا خیال رکھا جاتا ہے نہ کہ الفاظ کا“

عظیم محدث امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((فعلهم ان الاعتبار في العقود والافعال بحقائقها ومقاصدها دون

ظواهر الفاظها و افعالها)) [اعلام الموقعين: ج ۳ ص ۲۸۰]

”معلوم ہوا کہ عقود اور افعال میں اصل اعتبار ان کے حقائق اور مقاصد کا ہے۔ ظاہری

الفاظ اور افعال کا نہیں۔“

اسلامی بینکاری کے معروف سکارڈا کٹر رفیق یونس مصری لکھتے ہیں:

((لو ان هذين الاثنين اللذين اشتركا في ملكية العقار اتفاقا منذ الاشتراك في العقار على ان يسدد احدهما اقساطا محددة ، يصبح مالكا بعدها للعقار كله ، سواء كان خلال المدة مستاجرا لحصة شريكه او غير مستاجر لها ، فان هذا بنظرى غير جائز وكذلك لو اتفاقا قبل الدخول في شركة العقار ان يبيع احدهما لآخر حصته بيع تقسيط فهذا غير جائز لان بيع التقسيط غير جائز بل لانه شاركه على ان يبيعه فعرف ان المراد ليس هو الشركة ولا البيع ولا الايجار انما المراد هو التمويل ، ودخول البيع والايجار عليه انما الغرض هو الوصول الى فائدة من وراء هذا التمويل)) [المصارف الاسلاميه: ص ٤١]

”اگر یہ دونوں جو ریل پر اپرٹی کی ملکیت میں شراکت دار ہیں شروع ہی سے اس بات پر اتفاق کر لیں کہ ان میں سے ایک متعینہ اقساط ادا کر کے مکمل پر اپرٹی کا مالک بن جائے گا خواہ دوران مدت شریک کے حصے کا کرایہ ادا کرے یا نہ، تو میری نظر میں یہ معاملہ جائز نہیں۔ اسی طرح اگر یہ دونوں ریل پر اپرٹی کی شراکت میں داخل ہونے سے پہلے اس پر متفق ہو جائیں کہ ان میں سے ایک اپنا حصہ قسطوں میں دوسرے کو بیچ دے گا یہ بھی جائز نہیں اس لیے نہیں کہ بیع قسط جائز نہیں بلکہ اس لیے کہ اس نے اس شرط پر شراکت داری کی ہے کہ وہ اپنا حصہ اسے فروخت کر دے گا تو اس سے معلوم ہوا کہ شرکت، بیع اور اجارہ مقصود نہیں بلکہ مقصود تمویل ہے بیع اور اجارہ کو اس پر داخل کرنے کی غرض اس تمویل کے پردے میں فائدہ حاصل کرنا ہے“

شرح سود کو معیار بنانا:

❁ اسلامی بینک مراہجہ اور اجارہ وغیرہ کو جو اپنی اصل کے اعتبار سے طریقہ ہائے تمویل

(Modes of Financing) نہیں ہیں کو تمویلی سرگرمیوں کے لیے استعمال کرتے وقت اپنے نفع کا تعین شرح سود کے مطابق کرتے ہیں چنانچہ جامعہ دارالعلوم کراچی کے استاد اور اسلامی بینکاری کے سرگرم حامی جناب مولانا ڈاکٹر اعجاز احمد صدیقی لکھتے ہیں۔

”چوتھا مسئلہ یہ ہے کہ موجودہ حالات میں اسلامی بینک عام طور پر مروجہ بینکوں کے باہمی شرح سود کو معیار (Bench Mark) کے طور پر استعمال کر کے اپنے نفع یا کرایہ کا تعین کرتے ہیں جیسے پاکستان میں کابور Kibor (Karachi inter bank offered rate) سود کی وہ شرح جس پر کراچی کے بینک ایک دوسرے سے لین دین کرتے ہیں۔) کو معیار بنایا جاتا ہے اس پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ ایسا کرنا جائز نہیں۔ [اسلامی بینکاری، ایک حقیقت پسندانہ جائزہ: ص ۵۲]

مولانا موصوف نے اس کو جواز بخشے کے لیے جو تاویل کی ہے اس پر وہ خود بھی مطمئن نہیں یہی وجہ ہے کہ ایک صفحہ بعد ہی ”مقابل کی تلاش بھی کرنی چاہیے“ کا عنوان قائم کر دیا ہے۔ دوسری جگہ مزاحمہ میں نفع کو کابور کے ساتھ مربوط کرنے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

”اس صورت میں اس اعتبار سے تو عقد درست ہو جاتا ہے کہ بچی گئی چیز کی قیمت متعین ہو جاتی ہے لیکن اس اعتبار سے اس میں ناپسندیدگی کا عنصر شامل ہو جاتا ہے کہ اس میں ایک شرح سود کو بطور بیع مارک استعمال کیا گیا ہے۔ اس لیے اسلامی بینکوں کو چاہیے کہ کوئی اسلامی بیع مارک تشکیل دیں تاکہ اس ناپسندیدگی کے عنصر کا بھی خاتمہ ہو سکے۔“ [اسلامی بینکاری اور غرر: ص ۵۶]

صدیقی صاحب کے استاد گرامی مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب جو متعدد اسلامی بینکوں کی شرعی رہنمائی کا فرض سرانجام دے رہے ہیں روزنامہ امت کو انٹرویو دیتے ہوئے ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

”مثالی نظام مشارکہ اور مضاربہ معاشی انصاف فراہم کر سکتا ہے وہ وقت ابھی دور ہے کیونکہ مشارکہ اور مضاربہ کا استعمال Assests سائڈ پر بہت کم ہوتا ہے اور استعمال کم ہوئے پھر ان کی بنیاد پر Investment کم ہے لہذا اس کی جگہ ثانوی نوعیت کی



پراڈکٹ اجارہ، مرابحہ، Diminishing Musharaika وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔ ان میں مشکل یہ ہے کہ Bench mark وہی رہتا ہے جو سودی نظام میں ہے۔ اس کے معانی یہ ہیں کہ آپ کو روپیہ ادھار دینے کی بجائے کتاب بیچ دی کہ چھ مہینے بعد دینا۔ کتاب بیچ لیکن نفع Fix کر دیا اور ایک مخصوص مدت بعد وصولی کا معاہدہ کر لیا۔ اس منافع کمانے کا بیج مارک وہی ہے جو سودی نظام کا ہے اس لیے اسلامی نظام کے معاشرے پر جو اثرات ہونے چاہیے تھے وہ ابھی تک نہیں ہو رہے۔“ [روزنامہ امت: ۴ دسمبر ۲۰۰۵ء ص ۷۵، ۷۶]

حضرت مفتی صاحب بجا فرماتے ہیں کہ اجارہ، مرابحہ ثانوی نوعیت کے پراڈکٹ ہیں اور معاشرے پر ان کے وہ اثرات بھی مرتب نہیں ہو رہے جو اسلامی نظام کے ہونے چاہیں۔ تو کیا ہم یہ پوچھنے کی جسارت کر سکتے ہیں کہ پھر اس کو وقت کی ضرورت قرار دے کر فتوؤں کے ذریعے اسلامی ثابت کرنے کی کوشش کیوں کی جا رہی ہے؟

اسلامی بینکوں کا طریقہ بھی سودی بینکوں جیسا ہے:

❁ مثلاً سودی بینک کھاتہ داروں کو متعین منافع دیتے ہیں جو سود کے زمرہ میں آتا ہے۔ اسلامی بینک بھی یہی تاثر دیتے ہیں ثبوت کے لیے دیکھیے روزنامہ نوائے وقت ۳۰ جولائی ۲۰۰۸ صفحہ ۲ پر ایمیرٹس اسلامی بینک اور الفلاح اسلامی بینک کی طرف سے دیا گیا الگ الگ اشتہار۔ ایمیرٹس اسلامی بینک نے اپنے اشتہار میں 11.75 فیصد سالانہ منافع کا لالچ دیا ہے البتہ شارلگا کر ایک جانب باریک سایہ بھی لکھ دیا ہے:

”پانچ سالہ ڈیپازٹس پر گزشتہ ماہ کا اعلان کردہ منافع۔“

جبکہ الفلاح اسلامی بینک نے تین سالہ ٹرم ڈیپازٹ پر 10.1 فیصد ”حلال منافع“

دینے کا وعدہ کیا ہے اور شارلگا کر باریک سایہ لکھ دیا ہے:

”یہ مذکورہ منافع جون ۲۰۰۸ء میں دیا گیا آئندہ مختلف ہو سکتا ہے۔“

یہ بنارنگ دراصل مخالفین کو چپ کروانے کے لیے ہے۔ ورنہ حقیقت میں سودی بینکوں کی طرح پہلے سے متعین منافع دیا جاتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ الفلاح اسلامی بینک نے ۲۶ جولائی ۲۰۰۸ء کو اپنے ڈیپازٹرز کو جو لیز جاری کیا ہے اس میں سٹار کے بغیر صاف یہ لکھا ہے۔ ہمارے ہاں اکاؤنٹ کھلو اگر ہائی پرائٹ ریٹ حاصل کریں۔ اور مختلف ٹرم کے لیے مختلف طے شدہ ریٹ مقرر کیے گئے ہیں۔

✽ اگر آپ سودی بینک کے ساتھ لیز پر گاڑی لینے کا معاملہ کرتے ہیں تو بینک بکنگ کے لیے رقم جمع کروانے کی تاریخ سے ہی اپنا کرایہ وصول کرنا شروع کر دے گا خواہ آپ کو گاڑی تین ماہ بعد ملے کیوں؟

اس لیے کہ سودی نظام کا تقاضا ہے کہ جو رقم بینک کے کھاتے سے نکل گئی ہے بینک کو اس کا سود وصول ہو۔ کلائنٹ کو گاڑی کب ملتی ہے بینک کو اس سے غرض نہیں۔ اسلامی بینکوں میں رائج اجارہ میں بھی یہی ہوتا ہے مگر اس ترمیم کے ساتھ کہ اسلامی بینک ان تین ماہ کا کرایہ گاڑی ملنے کے بعد اس طرح وصول کرتا ہے کہ یا تو اس کو تمام اقساط میں ایڈجسٹ کر دیتا ہے یا پہلی قسط زیادہ رکھ کر یکمشت وصول کر لیا جاتا ہے۔ ثبوت کے لیے دیکھیے ماہر اسلامی بینکاری جناب محمد ایوب کی کتاب Undre standing Islamic Finance صفحہ: ۲۹۶۔ اسلامی بینک ان تین ماہ کا کرایہ سودی طریقہ کار کے تحت ہی لیتا ہے۔

تاخیر پر جرمانہ:

✽ سودی بینکوں کی طرح اسلامی بینک بھی ادائیگی میں تاخیر پر جرمانہ کرتے ہیں جو کہ اسلامی بینک کے زیر نگرانی قائم خیراتی فنڈ میں جمع کروایا جاتا ہے۔ یہاں بھی سودی فارمولا اختیار کیا جاتا ہے کہ ایک تو جرمانہ واجب الادا رقم کے تناسب سے عائد کیا جاتا ہے اور دوسرا تاخیر کی مدت بڑھنے کے ساتھ جرمانہ کی رقم میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

شریعت میں تاخیر پر جرمانہ کا تصور نہیں ہے:

قرآن وحدیث میں تاخیر پر جرمانہ کا تصور موجود نہیں اور نہ ہی فقہاء اس کی اجازت

دیتے ہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

((لا يحل ذنب من الذنوب مال انسان وان قتل نفسا))

[الطرق الحكمية: ص ۲۴۷]

”قتل سمیت کوئی گناہ انسان کے مال کو حلال نہیں کرتا۔“

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

((انما العقوبة في الابدان لا في الاموال)) [سنن بیہقی باب

ما يستدل به على ترك تضعيف الغرامة: ص ۲۸۸]

”سزا صرف جسمانی ہے نہ کہ مالی۔“

فقہ حنفی کی معروف کتاب المغنی میں ہے:

((والتعزير يكون بالضرب والحبس والتوبيخ ولا يجوز قطع

شيء منه ولا جرحه ولا اخذ ماله لان الشرع لم يرد بشيء من

ذلك عن احد يقتدى به)) [ايضاً۔ ج ۲۰، ص ۳۶۹]

”تعزیر مارنے، قید کرنے اور ڈانٹ ڈپٹ کے ذریعے ہوتی ہے اس کا کوئی حصہ کاٹنا یا

اسے زخمی کرنا یا اس کا مال لینا جائز نہیں کیونکہ جن لوگوں کی اقتداء کی جاتی ہے ان کے

حوالے سے شریعت میں اس طرح کی کوئی چیز بیان نہیں ہوئی۔“

فقہاء حنفیہ کے نزدیک بھی مالی جرمانہ جائز نہیں۔ چنانچہ علامہ ابن نجیم حنفی رحمۃ اللہ علیہ

لکھتے ہیں:

((والحاصل ان المذهب عدم التعزير بأخذ المال)) [البحر الرائق

شرح كنز الدقائق: فصل في التعزير ج ۱۳ ص ۱۶۸]

”خلاصہ کلام یہ ہے کہ حنفی مذہب کے مطابق مال لے کر تعزیری سزا جائز نہیں۔“

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں درمختار کے حوالے سے لکھا ہے:

((لا ياخذ المال في المذهب)) [فتاویٰ دارالعلوم: ج ۱۲،

ص ۲۵۲]

”خفی مذہب کے مطابق مالی جرمانہ درست نہیں۔“

نیز اسی صفحہ کے آخر میں ہے کہ جرمانہ مالی شرعاً درست نہیں۔

امام خطاب رحمہ اللہ کے قول سے غلط استدلال:

اسلامی بینکوں کے بعض حامی جرمانہ کے حق میں امام خطاب رحمہ اللہ کے اس قول سے استدلال کرتے ہیں۔

((اما اذا التزم المدعى عليه للمدعى انه ان لم يوفه حقه في وقت كذا وكذا فله عليه كذا وكذا فهذا لا يختلف في بطلانه لانه صريح الربا..... الى قوله واما اذا التزم انه لم يوفه حقه في وقت كذا فعليه كذا الفلان او صدقة للمساكين فهذا هو محل الخلاف)) [اسلام اور جدید معیشت و تجارت: ص ۱۳۵، از تلقی عثمانی بحوالہ تحریر الکلام فی مسائل الالتزام]

”جب مدعا علیہ مدعی کے لیے اپنے اوپر یہ لازم کر لے کہ اگر وہ اس کا فلاں وقت پر حق ادا نہیں کرے گا تو وہ اس کو اتنی رقم ادا کرے گا تو اس کے باطل ہونے میں کوئی اختلاف نہیں کیونکہ یہ صریح سود ہے اور جب یہ پابندی عائد کر لے کہ فلاں وقت اس کا حق ادا نہ کیا تو میں اتنے پیسے فلاں کو دوں گا یا مساکین پر صدقہ کروں گا تو اس کے جواز میں (قضاء) اختلاف ہے“

اگر غور کیا جائے تو امام خطاب رحمہ اللہ کے اس قول سے اسلامی بینکوں میں رائج مالی جرمانہ کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔

✽ ایک تو اس لیے کہ اسلامی بینکوں میں تاخیر پر جو جرمانہ وصول کیا جاتا ہے وہ واجب الادا رقم کے تناسب سے ہوتا ہے اور مدت بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ بھی ہوتا جاتا ہے جبکہ امام خطاب رحمہ اللہ کا یہ منشا قطعاً نہیں ہے۔

✽ دوسرا اس لیے کہ امام خطاب رحمہ اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ وہ یہ کہے کہ میں اتنی رقم قرض خواہ

کو دوں گا یا اس کی وساطت سے صدقہ کروں گا بلکہ انہوں نے تو فرمایا ہے کہ مدیون (Debtor) یہ کہے کہ میں اتنی رقم فلاں کو یعنی کسی دوسرے کو دوں گا یا مساکین پر صدقہ کروں گا اسلامی بینکوں میں یہ شرط ہوتی ہے کہ وہ اتنا جرمانہ بینک کے زیر نگرانی قائم خیراتی فنڈ میں جمع کروائے گا۔

تیسرا اس لیے کہ امام خطاب رحمۃ اللہ علیہ نے التزام کا لفظ بولا ہے جس کا مطلب ہے کہ مدیون اپنے ذمہ یہ لے نہ کہ دوسرا شخص یہ شرط لگائے۔ اس کے برعکس اسلامی بینکوں میں بینک کی طرف سے یہ شرط ہوتی ہے۔ اسلامی بینکاری کے حامی کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے شریعت میں تاخیر پر جرمانہ درست نہیں مگر چونکہ اس سے بینک کی آمدن میں اضافہ نہیں ہوتا اس لیے یہ جائز ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک بینک کی آمدن میں اضافہ نہیں ہوتا مگر مدیون کی جیب سے تو اتنی رقم نکل جاتی ہے شریعت کا یہ منشا تو ہرگز نہیں کہ قرض خواہ کی آمدن میں اضافہ ہو تو جرمانہ ناجائز ہے ورنہ جائز۔ اوپر فقہاء کے حوالے سے جو عبارتیں ہم نے نقل کی ہیں وہ بھی اس تاویل کو قبول کرنے سے اباہ کر رہی ہیں۔

اسلامی بینک نان ریسک ہیں:

سودی بینکوں کی طرح اسلامی بینک بھی Non Risk ہیں۔ اس کی واضح مثال یہ ہے کہ جب کوئی اسلامی بینک کے ساتھ مراحہ یا اجارہ کا معاملہ کرنے جاتا ہے تو بینک اس سے اچھی خاصی رقم جو عام طور پر مطلوبہ چیز کی قیمت کا دس فیصد ہوتی ہے ٹوکن منی (حاشیہ جدید) کے نام سے وصول کرتا ہے تاکہ اگر بعد میں وہ شخص چیز لینے سے انکار کر دے اور بینک کو وہ چیز دوسری جگہ قیمت لاگت سے کم پر فروخت کرنی پڑے تو بینک اس ٹوکن منی سے اپنا نقصان پورا کر سکے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کیا اسلامی بینکوں کے نزدیک یہ خطرہ مول لینا ریسک میں شامل نہیں؟ ممکن ہے اسلامی بینکنگ کے محققین فرمائیں کہ ہمارے نزدیک اس قسم کے خطرے میں پڑنا ریسک میں شامل

نہیں اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر دوسری جگہ بیچنے پر بینک کو فائدہ ہو کیا وہ یہ نفع خریداری کا آؤر دینے والے شخص کو دینے کے لیے تیار ہے؟ ظاہر ہے بینک اس پر تیار نہیں ہوگا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب بینک نقصان اٹھانے کے لیے تیار نہیں تو نفع کس بنیاد پر لیتا ہے؟

اسلامی بینکاری کے حامیوں کا نقطہ نظر یہ ہے کہ بینک چونکہ تجارتی ادارہ نہیں اس لیے بینک کے لیے اس طرح کا خطرہ مول لینا ممکن نہیں اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تو ان لوگوں کے موقف کی تائید ہے جو کہتے ہیں کہ بینک صرف کاغذوں کی حد تک کاروبار کرتا ہے عملاً اس کا کاروبار سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اسلامی بینکنگ کے حامی جس کو رسک قرار دیتے ہیں وہاں بھی بینک خود کو انشورنس کے ذریعے محفوظ رکھتا ہے اور انشورنس کی رقم بھی لاگت میں شمار کر کے کلائنٹ سے وصول کر لیتا ہے۔ یعنی رسک کی ساری ذمہ داری کلائنٹ کی ہے۔ اسلام میں حقیقی رسک اٹھائے بغیر نفع لینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اسلامی بینکوں میں رائج طریقہ ہائے تمویل کی حقیقت:

علاوہ ازیں اسلامی بینکوں میں سرمایہ کاری اور لوگوں کی مالی ضرورتیں پوری کرنے کے جو طریقے مضاربہ، مراضہ، مشارکہ، اجارہ اور بیع تورق رائج ہیں وہ اس سادہ صورت میں موجود نہیں جو کتب حدیث و فقہ میں بیان ہوئی ہیں۔ جیسا کہ ذیل کی تفصیل سے ثابت ہوتا ہے۔

مضاربہ:

اسلامی بینکوں میں زیادہ تر کھاتے مضاربہ کی بنیاد پر کھولے جاتے ہیں۔ مضاربہ کو قراض اور معاملہ بھی کہا جاتا ہے اس کا اطلاق کاروبار کی اس صورت پر ہوتا ہے جس میں ایک شخص جس کو رب المال (مال کا مالک) کہتے ہیں کا سرمایہ ہوتا ہے اور دوسرا شخص جس کو مضارب یا عامل کہا جاتا ہے اس سرمایہ کی بنیاد پر تجارت کرتا ہے۔ اس تجارت سے جو نفع

حاصل ہوتا ہے اس میں دونوں آپس میں طے شدہ تناسب سے شریک ہوتے ہیں۔ چنانچہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

((القراض والمضاربة ان يدفع اليه ما لا ليتجر فيه والربح

(مشترك)) [المنهاج: كتاب القراض ج ۱ ص ۲۲۹]

”قراض اور مضاربہ کا یہ مطلب ہے کہ ایک شخص دوسرے کو مال دے تاکہ وہ اس میں تجارت کر لے اور نفع دونوں میں مشترک ہو“

نیل المآرب میں ہے:

((وهي شرعا ان يدفع انسان من ماله الى انسان آخر شيئاً او يكون

له تحت يده على سبيل الوديعة او الغصب مال ويأذن له ليتجر فيه

ويكون الربح بينهما بحسب ما يتفقان عليه)) [نیل المآرب شرح

دلیل الطالب ص ۱۹۴]

”مضاربہ کا شرعی معنی یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے کو اپنے مال میں سے کچھ دے یا اس کا مال پہلے ہی سے بطور امانت اس کے پاس پڑا ہو یا اس نے غصب کر رکھا ہو اور وہ اس کو اجازت دے دے کہ وہ اس میں تجارت کرے اور نفع ان دونوں کے درمیان اس تناسب سے ہوگا جس پر وہ متفق ہوں۔“

الملخص الفقہی میں مضاربہ کا مفہوم یوں بیان ہوا ہے:

((دفع مال معلوم لمن يتجر به ببعض ربحه)) [ایضاً - ۲ - ص ۷۱]

”نفع کے کچھ حصے کے بدلے مال اس شخص کے حوالے کرنا جو اس کو تجارت میں لگائے۔“

مضاربہ کی صورت میں اگر تجارت میں خسارہ ہو جائے تو اس کا ذمہ دار صرف رب

المال ہوتا ہے۔ مضارب اس میں حصہ دار نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ وہ اپنی محنت کے ثمرہ

سے محروم رہتا ہے جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے:

((الوضیعة علی المال والربح علی ما اصطلاحوا علیہ))

[مصنف عبد الرزاق: ج ۸ ص ۲۴۸]

”خسارہ رب المال کا ہوگا اور نفع اس تناسب سے جس پر انہوں نے اتفاق کیا ہو۔“

مضارب کی حیثیت:

امام ابن قیم رحمہ اللہ کے نزدیک مضارب کی چار حیثیتیں ہیں:

(۱) امین (۲) اجیر (۳) وکیل (۴) شریک

وہ فرماتے ہیں کہ امین تو وہ اس اعتبار سے ہے کہ مال اس کے قبضہ میں ہے اور مال میں تصرف کے اعتبار سے وہ وکیل ہے (مال کے مالک کا نمائندہ) اور عملی اعتبار سے اجیر ہے جب اس مال میں نفع حاصل ہو جائے تو تب وہ شریک ہوگا۔ [الملخص الفقہی: ج ۲ ص ۷۱]

صاحب ہدایہ فرماتے ہیں جو مال مضارب کے حوالے کیا گیا ہے وہ اس کے پاس امانت ہے اور وہ اس میں وکیل بھی ہے کیونکہ وہ مال کے مالک کے حکم سے تصرف کرتا ہے جب فائدہ ہو تب وہ شریک بن جاتا ہے کیونکہ اپنے عمل کی بدولت مال کے ایک حصے کا مالک بن چکا ہے۔ [ہدایہ مع البناہ: ج ۱۰ ص ۴۴، ۴۵]

مضاربہ کی شرطیں:

مضاربہ میں جن شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے ان میں سے ایک بنیادی شرط یہ ہے کہ نفع میں فریقین میں سے ہر ایک کے حصہ کا تناسب پہلے سے طے ہو مثلاً نفع رب المال اور مضارب میں برابر تقسیم ہوگا یا رب المال نفع کے ساٹھ فیصد اور مضارب چالیس فیصد کا حقدار ہوگا کیونکہ مضاربہ میں اصل عقد منافع پر ہوتا ہے اگر یہ مجہول ہو تو مضاربہ فاسدہ ہو جائے گا۔ جیسا کہ بدائع الصنائع ج ۳ ص ۱۷۱ میں ہے۔ امام مالک کے نزدیک نفع کی تقسیم کے وقت رب المال کا موقع پر موجود ہونا بھی ضروری ہے چنانچہ مؤطا میں ہے:

((قال مالك: في رجل دفع الى رجل مالا قراضا فعمل به فربح

فأراد ان يأخذ حصته من الربح وصاحب المال غائب قال

لا ينبغي له ان ياخذ منه شيئاً الا بحضرة صاحب المال))

[كتاب القراض: باب المحاسبه فى القراض]

”اس شخص کے بارے میں جو دوسرے کو مضاربہ کی بنیاد پر مال دیتا ہے وہ اسے کام میں لا کر نفع حاصل کرتا ہے اب وہ یہ چاہتا ہے کہ رب المال کی غیر موجودگی میں ہی نفع سے اپنا حصہ لے لے امام مالک نے فرمایا جب تک مال کا مالک موجود نہ ہو اس کو یہ حق نہیں پہنچتا۔“

اسی طرح اگر کسی آدمی نے دوسرے کو مضاربہ کی بنیاد پر مال دیا اس نے تجارت کے ذریعے نفع کمایا پھر اس المال کو الگ کر کے نفع سے اپنا حصہ لے لیا اور رب المال کا حصہ گواہوں کی موجودگی پر مال میں شامل کر دیا، امام مالک فرماتے ہیں کہ جب تک مال کا مالک موجود نہ ہو نفع تقسیم کرنا درست نہیں۔ اگر مضارب نے از خود کوئی چیز لی ہو تو وہ اسے واپس کرے حتیٰ کہ مال کا مالک اپنا مال وصول پالے پھر جو باقی بچے اس کو دونوں آپس میں تقسیم کر لیں۔ [حوالہ مذکورہ]

امام مالک رحمہ اللہ کی بات ہر لحاظ سے عقلی میزان پر پورا اترتی ہے اس لیے کوئی دانشور اس سے اختلاف نہیں کر سکتا۔ بات تو سیدھی سی ہے کہ جب رب المال اور مضارب دونوں نفع میں شریک ہیں تو کیا اس کا فرض نہیں کہ وہ رب المال کو اعتماد میں لے اور بتائے کہ میں نے یہ کاروبار کیا اتنے اخراجات آئے باقی یہ نفع ہے نہ کہ باقی سب فیصلے خود ہی کر لے۔

مضاربہ کا میدان:

اکثر فقہاء کے نزدیک مضاربہ کا مال تجارتی سرگرمیوں کے علاوہ استعمال نہیں کیا جاسکتا چنانچہ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((عقد القراض يقتضى تصرف العامل فى المال بالبيع والشراء،

فإذا قارضه على أن يشتري به نخلاً يمسك رقابها ويطلب

ثم رها لم يحز لانه قيد تصرفه الكامل بالبيع والشراء، ولأن

القراض مختص بما يكون النماء فيه نتيجة البيع والشراء وهو في النخل نتيجة عن غير بيع وشراء فبطل أن يكون قراضاً ولا يكون مساقاة، لأنه عاقده على جهالة بها قبل وجود ملكها، وهكذا لو قارضه على شراء دواب أو مواشى يحبس رقابها ويطلب نتائجها لم يجز لما ذكرنا)) [المجموع: ج ٤ ص ٣٧١]

”عقد مضاربہ یہ تقاضا کرتا ہے کہ مضارب مال میں خرید و فروخت کے ذریعے تصرف کرے چنانچہ جب وہ اس طرح مضاربہ کرے کہ وہ اس مال سے کھجوروں کے درخت خریدیگا اور ان سے پھل حاصل کرے گا تو یہ جائز نہیں کیونکہ قید یہ ہے کہ کامل تصرف خرید و فروخت کے ذریعے ہو اور دوسری وجہ یہ ہے کہ مضاربہ ان معاملات کے ساتھ مختص ہے جہاں مال میں اضافہ خرید و فروخت کے نتیجے میں ہو جبکہ کھجوروں میں یہ اضافہ خرید و فروخت کے نتیجے میں نہیں اس لیے اس کا مضاربہ باطل ٹھہرا اور یہ مساقات کا معاملہ بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ اس صورت میں یہ کھجوروں کی ملکیت وجود میں آنے سے پہلے مجہول درختوں پر عقد ہوگا اسی طرح اگر اس طرح مضاربہ کر لے کہ وہ جانور یا مولیٰ خریدے گا جو بذات خود تو اس کے پاس محفوظ ہو گئے مگر ان کی پیداوار حاصل کرے گا تو یہ بھی جائز نہیں وجہ وہی ہے جو ہم نے اوپر ذکر کی ہے یعنی یہ نفع خرید و فروخت کے نتیجے میں حاصل نہیں ہوا۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

((لو قارضه على أن يشتري الحنطة فيطحنها ويخبزها والطعام ليطبخه ويبيعه والغزال لينسجه والثوب أو ليقصده والديع بينهما فهو فاسد..... قارضه على دراهم على أن يشتري نخيلاً أو دواب أو مستغلات ويمسك رقابها لثمارها ونتائجها وغلاتها وتكون الفوائد بينهما فهو فاسد لأنه ليس ربحاً بالتجارة بل من عين

(المال)) [روضة الطالبين: ج ٢، ص ١٨٨]

”اس کا مطلب یہی ہے کہ مضاربہ کا مال تجارتی سرگرمیوں کے علاوہ دوسری پیداواروں سکیموں میں استعمال نہیں ہو سکتا جیسے کوئی اس بات پر مضاربہ کر لے کہ وہ گندم خرید کر اسے بیچے گا یا اور نفع دونوں میں تقسیم ہوگا تو یہ مضاربہ فاسدہ ہوگا کیونکہ یہ نفع تجارت کے ذریعے حاصل نہیں ہوا بلکہ خود مال سے جنم لیا ہے“

امام ابوالقاسم عبدالکریم الرافعی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

((لو قارضه على ان يشتري الحنطة فيطبخها ويختبرها والطعام ليطبخه ويبيع والربح بينهما فهو فاسد ان الطبخ والخبر ونحوهما اعمال مضبوطة يمكن الاستحجار عليها وما يمكن الاستحجار عليه فلسيغنى عن الفرائض انما القراض لما لا يجوز الاستحجار عليه وهو التجارة التي لا ينضبط قدرها)) [فتح القدیر شرح الوحیز: ج ۱۲ ص ۱۱]

”یعنی مضاربہ کے مال سے صرف تجارت کی جاسکتی ہے دوسرے نفع بخش کاموں میں لگانے کی اجازت نہیں کیونکہ مضاربہ وہاں ہوتا ہے جہاں اجارہ نہ ہو سکے اور وہ تجارت ہے جہاں اجارہ ہو سکے وہاں مضاربہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔“

فقہاء حنفیہ کے نزدیک بھی مضاربہ کا مال صرف تجارت اور اس سے متعلقہ سرگرمیوں میں ہی لگایا جاسکتا ہے جیسا کہ ہدایہ میں ہے:

((فيننظم العقد صنوف التجارة وما هو من صنيع التجار))

[هدایہ مع البنایہ: ج ۱۰ ص ۵۲]

دوسری جگہ ایک مسئلہ کی وضاحت میں لکھتے ہیں کہ یہ امام محمد اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک اس لیے جائز نہیں کہ یہ تجارت میں شامل نہیں اور عقد مضاربہ کا مقصد صرف تجارت میں کسی کو ایجنٹ بنانا ہے مزید لکھتے ہیں کہ ”جب یہ تجارت نہیں تو مضاربہ میں بھی شامل نہیں۔“ [هدایہ مع البنایہ: ج ۱۰ ص ۸۷]

علامہ زکریا انصاری رحمۃ اللہ علیہ رقم طراز ہیں:

((لَوْ قَارَضَهُ عَلَى أَنْ يَشْتَرِيَ بِالْذَّرَاهِمِ نَحْلًا لَيْسَتْ غَلَّةٌ، وَالرَبْحُ بَيْنَهُمَا؛ لِأَنَّ مَا حَصَلَ لَيْسَ بِتَصَرُّفِ الْعَامِلِ، وَإِنَّمَا هُوَ مِنْ عَيْنِ الْمَالِ)) [البهجة الوردية: باب القراض ج ۱ ص ۴۸۰]

”اگر کوئی یوں مضاربہ کر لے کہ وہ درہموں سے کھجوروں کے درخت خریدے گا تا کہ ان کی آمدن حاصل کرے اور نفع دونوں کے درمیان تقسیم ہوگا تو یہ بھی جائز نہیں کیونکہ اس صورت میں جو نفع حاصل ہوا ہے وہ مضاربہ کے تصرف کا نتیجہ ہے وہ تو مال کا اپنا حصہ ہے۔“

مذکورہ بالا عبارتیں اس امر کا یقین ثبوت ہیں کہ ان جلیل القدر فقہاء کے نزدیک مضاربہ کا مال تجارتی سرگرمیوں کے علاوہ دوسرے نفع بخش منصوبوں میں استعمال نہیں ہو سکتا۔ ایک تو اس لیے کہ دوسرے منصوبوں کے ذریعے جو فائدہ حاصل ہوگا وہ مضارب کی محنت کی بجائے خود مال کا نتیجہ ہوگا۔ جیسا کہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ زکریا انصاری رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔

اور دوسرا اس لیے کہ مضاربہ صرف اس چیز میں ہوتا ہے جو غیر منضبط ہو اور وہ صرف تجارت ہے۔ جہاں اجارہ ہو سکے وہاں مضاربہ کی ضرورت نہیں ہوتی جیسا کہ امام عبدالکریم الرافعی نے ذکر کیا ہے۔

چونکہ دلائل کے اعتبار سے یہ نقطہ نظر قوی ہے اس لیے اسلامی بینکاری کے حامی بھی یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ بنیادی طور پر مضاربہ تجارت میں ہی ہوتا ہے۔ دوسرے زرعی اور صنعتی منصوبوں میں اس کا استعمال اس کے مفہوم میں وسعت پیدا کر کے کیا جانے لگا ہے چنانچہ عالمی سطح پر اسلامی بینکوں کی شرعی رہنمائی کے لیے قائم تنظیم ”ہیئۃ المحاسبۃ والمراجعة للمؤسسات المالية الإسلامية“ Accounting And Auditing Organization for Islamic Financial Institutions (مخفف: AAOFI) کے شائع کردہ المعايير الشرعية میں ہے۔

((والمضاربة من الصيغ التي تستخدم غالباً في التجارة ثم توسعت استخداماتها حتى شملت مجالات الاستثمار التجارية والزراعية والصناعية والخدمية وغيرها)) [ايضاً۔ ص ۲۳۲]

”مضاربہ ان طریقوں میں سے ہے جو زیادہ تر تجارت میں استعمال کیا جاتا ہے پھر اس کے استعمال میں وسعت پیدا ہوگی یہاں تک کہ تجارتی، زرعی اور صنعتی سرمایہ کاری وغیرہ کو بھی شامل ہو گیا۔“

مضاربہ کے مفہوم میں یہ وسعت کس نے پیدا کی کب کی اور کس بنیاد پر کی؟ ہمیں پورا یقین ہے کہ اسلامی بینکنگ کے حامیوں کے پاس اس کا کوئی ایسا جواب نہیں ہے جو اہل علم کو مطمئن کر سکے یہی وجہ ہے کہ المعايير الشرعية کے قابل احترام علماء کرام نے اس کے متعلق اس سے زیادہ لب کشائی نہیں فرمائی۔

اسلامی بینکوں میں رائج مضاربہ کی حقیقت:

اگر اسلامی بینکاری کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ اسلامی بینکوں میں رائج مضاربہ میں اوپر بیان کردہ اصولوں اور شرطوں کا پوری طرح خیال نہیں رکھا جاتا اور نہ ہی یہ عدل و انصاف پر مبنی ہے۔ اسکی وضاحت کے لیے ذیل کی سطور ملاحظہ فرمائیں۔

❁ اگرچہ اسلامی بینکوں میں یہ سہولت موجود ہے کہ اگر کوئی ڈیپازیٹر یہ جاننا چاہے کہ نفع کی تقسیم کس تناسب سے ہوگی تو متعلقہ بینک کے ذمہ دار بتانے کے پابند ہیں یا وہ خود بھی بینک کی ویب سائٹ پر دیکھ سکتا ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی ہوتا ہے کہ ڈیپازیٹر سے جو فارم پر کروایا جاتا ہے اس میں صاف لکھا ہوتا ہے کہ بینک یہ تناسب تبدیل کرنے کا بھی مجاز ہے تاہم اس صورت میں بینک کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ تبدیل شدہ تناسب اپنی ویب سائٹ پر جاری کرے یا لکھ کر نوٹس بورڈ پر آویزاں کرے۔ اب یہ تبدیل شدہ تناسب کتنی مدت کے لیے ہوگا اس کا ذکر نہیں ہوتا اس سے یہ معاملہ ناجائز ہو

جاتا ہے۔ اسلامی بینکنگ کے مؤیدین بھی اس بات کے قائل ہیں کہ یہ صراحت ہونی چاہیے کہ نفع کی تقسیم کا یہ فارمولا کب تک چلے گا۔ [دیکھیے: المعاییر الشرعیۃ ص: ۲۲۴]

اسلامی بینکوں میں نفع کی تقسیم کے لیے رقم کی کمی بیشی کی بنیاد پر ڈیپازٹر کی رقم کا الگ الگ وزن مقرر کیا جاتا ہے جس کی رقم زیادہ ہو اس کا وزن زیادہ رکھا جاتا ہے اور جس کی رقم تھوڑی ہو اس کا کم۔ مثلاً میزان بینک کی ویب سائٹ سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق ماہ اپریل 2008ء کا وٹج اسائنڈ یوں ہے: اگر رقم 10,000 سے لیکر ایک لاکھ سے کم تک ہو تو وٹج اسائنڈ 0.31 ہوگا اور اگر رقم ایک لاکھ سے لیکر 0.99 ملین تک ہو تو وٹج اسائنڈ 0.36 تک ہوگا۔ گویا اسلامی بینکوں میں کم رقم رکھنا جرم ہے جس کی سزا یہ ہے کہ اس کی رقم کا وزن کم رکھا جائے۔ وٹج اسائنڈ کو رقم کی کمی بیشی سے مربوط کرنا عدل کے خلاف ہے۔ ۱۹۸۷ء میں خود اسٹیٹ بینک اسکو غلط کہہ چکا ہے۔ دیکھیے B-C-D کا جاری کردہ سرکیولر نمبر 6 بتاریخ 12-7-1987۔

یہاں ایک اور زیادتی بھی کی جاتی ہے وہ یہ کہ مضاربہ میں بینک کی اپنی رقم بھی ہوتی ہے بینک اس کا وٹج اسائنڈ ڈیپازٹر سے مختلف رکھتا ہے۔ مثلاً اسی ماہ اپریل میزان بینک نے اپنی رقم کا وٹج اسائنڈ 1.7 رکھا ہے۔ یہ فرق خود اس اصول کے بھی خلاف ہے وہ اس طرح کہ اگر بینک نے مثلاً مضاربہ میں ایک ارب روپیہ لگایا ہے اور اس میں نوے کروڑ کھاتہ دار کا اور دس کروڑ بینک کا تو اس اصول کے مطابق کھاتہ داروں کے وٹج اسائنڈ بینک کی رقم سے زیادہ ہو جانا چاہیے۔ کیونکہ مجموعی اعتبار سے کھاتہ داروں کی رقم زیادہ ہے لیکن بینک نے الٹا اپنی رقم کا وٹج اسائنڈ زیادہ رکھا ہوتا ہے۔ ممکن ہے یہاں کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہو کہ جب اسٹیٹ بینک نے ۱۹۸۷ء میں اس سے روک دیا تھا پھر اسلامی بینک ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بعد میں جب کچھ وجوہ کی بنا پر یہ پابندی اٹھالی گئی تو اسلامی بینکوں نے بھی اس سے فائدہ اٹھایا مگر سوال یہ ہے کہ کیا اسٹیٹ بینک کی پابندی ختم ہونے سے ایک غلط کام جائز ہو جاتا ہے اگر یہ اصول درست ہے تو بینک

اور کھاتہ دار دونوں کے لیے یکساں ہونا چاہیے۔

❁ اسلامی بینکوں میں رائج مضاربہ میں تیسری خرابی یہ ہے کہ ڈیپازٹر بینک کا شریک ہے۔ اس ناطے بینک پر لازم ہے کہ اس کو اعتماد میں لے جس طرح بینک اپنے شیئر ہولڈرز کے ساتھ معاملہ کرتا ہے اور بورڈ آف ڈائریکٹر شیئر ہولڈرز کی نمائندگی کرتا ہے۔ بینک سے متعلقہ ہر چیز اس کے علم میں ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ڈیپازٹر کو کوئی علم نہیں ہوتا کہ بینک کیا کر رہا ہے اور کتنا نفع ہوا ہے جو بینک دے دے کھاتہ دار پر اس کو قبول کرنا فرض ہوتا ہے۔ اسلامی بینکوں کے فارمز میں بھی یہ درج ہوتا ہے کہ بینک نے جو نفع تقسیم کر دیا ڈیپازٹر اس کو قبول کرنے کا پابند ہوگا کسی کو اعتراض کا حق نہیں ہوگا۔ ہم اسلامی بینکاری کے حامیوں سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ شرط قرین انصاف ہے؟

اسلامی بینکاری کے سکارڈاکٹر رفیق یونس مصری اسلامی بینکنگ میں حائل موانع اور مشکلات ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

((الا ان المودعين يشكون من صعوبة اخرى هي انهم شركاء فيما بينهم بالمال ولكنهم مششون لا تجمعهم اى جمعية او هيئة لحماية مصالحهم حيال المساهمين فى المصرف الذين تجمعهم جمعية عمومية ويمثلهم مجلس ادارة)) [المصارف الاسلاميه: ص ٢٥]

”بلاشبہ ڈیپازٹر ایک اور مشکل کا شکار کرتے ہیں وہ یہ کہ وہ مال کے ساتھ بینک کے شریک ہیں لیکن بینک میں حصہ دار جنگی نمائندگی بورڈ آف ڈائریکٹر زکر رہا ہوتا ہے کے مقابلے میں ان کے مفادات کے تحفظ کے لیے کوئی تنظیم یا بورڈ نہیں۔“

❁ چوتھی بڑی خرابی یہ ہے کہ اسلامی بینک فقہاء کی اکثریت کے نقطہ نظر کے مطابق مضاربہ کا مال صرف تجارت میں ہی نہیں لگاتے بلکہ دوسرے منصوبوں پر بھی لگاتے ہیں۔

مراہجہ:

مروجہ اسلامی بینکوں نے فنانسنگ کے جو مختلف طریقے متعارف کرائے ہیں ان میں سرفہرست مراہجہ ہے۔ جس کو اسلامی بینکنگ کے نام پر وسیع پیمانے پر فروغ حاصل ہوا ہے۔ بیج مراہجہ کا مفہوم یہ ہے کہ فروخت کنندہ کوئی چیز اس وضاحت کے ساتھ بیچے کہ میں نے یہ اتنے میں خریدی ہے اور اب اتنے منافع کے ساتھ فلاں قیمت پر تمہیں فروخت کرتا ہوں۔ چنانچہ علامہ موفق الدین ابی محمد عبداللہ بن احمد بن محمد قد امہ حنبلی مقدسی فرماتے ہیں:

((مَعْنَى بَيْعِ الْمُرَابَحَةِ، هُوَ الْبَيْعُ بِرَأْسِ الْمَالِ وَرِبْحٍ مَعْلُومٍ، وَيُشْتَرَطُ عَلَيْهِمَا بِرَأْسِ الْمَالِ فَيَقُولُ رَأْسُ مَالِي فِيهِ أَوْ هُوَ عَلَيَّ بِمِائَةِ بَعْتُكَ بِهَا، وَرِبْحٌ عَشْرَةٌ)) [المغنی: ۶، ص: ۲۶۶]

”مراہجہ کا معنی ہے اصل لاگت اور متعین نفع کے ساتھ فروخت کرنا اس میں ضرور ہے کہ فروخت کنندہ اور مشتری کو اصل لاگت معلوم ہو، چنانچہ بیچنے والا کہے کہ اس میں میرا اصل سرمایہ مجھے یہ ایک سو کی پڑی ہے میں آپ کو دس نفع لے کر اتنے میں بیچتا ہوں۔“

لغت کی مشہور کتاب ”المعجم الوسیط“ میں ہے:

((هو بيع برأس المال مع زيادة معلومة))

اصل قیمت پر متعین نفع کے ساتھ فروخت کرنا بیج مراہجہ ہے۔ عام بیج اور مراہجہ میں یہ فرق ہے کہ عام بیج میں چیز کی اصل قیمت اور اپنا نفع بتانا ضروری نہیں ہوتا جبکہ مراہجہ میں مشتری کو اصل قیمت سے آگاہ کرنا لازمی شرط ہے۔

مراہجہ کی ضرورت اور اس کے بنیادی اصول:

مراہجہ ایک تمدنی اور معاشرتی ضرورت ہے کیونکہ ہر آدمی میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ کسی چیز کو اس کی اصل قیمت پر مناسب نفع کے بدلے خرید سکے بعض دفعہ تو فروخت کنندہ اصل قیمت سے بھی کئی گنا زیادہ نفع مانگ لیتا ہے۔ اس بناء پر انسان سوچتا ہے کہ کوئی

ایسا شخص مل جائے جو اپنی لاگت پر معقول نفع لے کر بیچنے پر تیار ہو۔ اس لحاظ سے بیع مباح کی بنیاد امانت داری پر ہے لہذا اس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ یہ ہر قسم کی خیانت اور غلط بیانی سے مبرا ہو اور مشتری کو اصل قیمت کا علم ہو جیسا کہ ”الموسوعة الفقهية الكويتية“ میں ہے۔

((يشترط ان يكون الثمن الاول معلوما للمشتري الثاني لان العلم بالثمن شرط في صحة البيوع فاذا لم يعلم الثمن الاول فسد العقد))
 ”اس میں یہ شرط ہے کہ مشتری ثانی کو پہلی قیمت کا علم ہو۔ کیونکہ بیوع کے صحیح ہونے کے لیے قیمت کا علم شرط ہے۔ جب پہلی قیمت کا علم نہیں ہوگا تو عقد فاسد ہو جائے گا۔“

مباح کی مختلف قسمیں اور ان کا شرعی حکم:

نفع کے تعین کے اعتبار سے مباح کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ پوری قیمت پر نفع کی ایک مخصوص مقدار مقرر کر لی جائے۔ مثلاً یوں کہا جائے کہ اس قیمت سے اتنے روپے زائد میں بیچتا ہوں یہ صورت سب کے نزدیک جائز ہے۔ چنانچہ علامہ موقوف الدین ابی محمد عبداللہ بن احمد بن محمد قدامہ حنبلی مقدسی رقم طراز ہیں:

((فَهَذَا جَائِزٌ لَا خِلَافَ فِي صِحَّتِهِ ، وَلَا نَعْلَمُ فِيهِ عِنْدَ أَحَدٍ

كَرَاهَةً)) [المغنی: ۶ ص ۲۶۶]

”یہ جائز ہے کہ اس کے صحیح ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہمیں علم نہیں کہ اس کے متعلق کسی سے کراہت منقول ہو۔“

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ نفع کا ایک خاص تناسب طے کر لیا جائے مثلاً یوں کہا جائے کہ اصل قیمت پر اتنے فیصد زائد نفع وصول کروں گا۔ صحابہ اور فقہاء کے ہاں یہ صورت بیع دہ یازدہ ”یا“ دہ دوازدہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس چیز میں میرا اصل سرمایہ اتنے روپے ہے اور میں ہر دس کے بدلے ایک روپیہ یا ہر دس کے بدلے

دور پے نفع لوں گا اس کے جواز میں اختلاف ہے۔

قاضی شریح سعید بن مسیب اور ابراہیم نخعی اس کے جائز ہونے کے قائل ہیں۔ چنانچہ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نقل فرماتے ہیں:

((عن شريح وسعيد بن المسيب و ابراهيم النخعي انهم كانوا يبيعون

بيع ده دوازده)) [السنن الكبرى: كتاب البيوع، باب المراءحه]

”شریح سعید بن مسیب اور ابراہیم نخعی بیع دہ دوازدہ جائز قرار دیتے ہیں۔“

امام ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے:

((لا باس ببيع ده دوازده)) [مصنف عبد الرزاق: كتاب البيوع، باب

بيع ده دوازده]

”بیع دہ دوازدہ میں کوئی حرج نہیں۔“

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل کیا ہے:

((لَا بَأْسَ بِالْعَشْرَةِ بِأَحَدٍ عَشَرَ، وَيَأْخُذُ لِلنَّفَقَةِ رُبْعًا)) [صحيح بخاری:

كتاب البيوع، باب من احرى الامصار على ما يتعارفون بينهم في

البيوع والاحازة]

”اس میں کوئی حرج نہیں کہ دس کو گیارہ کے بدلے بیچے اور اخراجات پر بھی نفع وصول کریں۔“

شیخ الاسلام حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اس کی تشریح میں لکھتے ہیں:

((أَيُّ لَا بَأْسَ أَنَّ يَبِيعَ مَا اشْتَرَاهُ بِمِائَةِ دِينَارٍ مَثَلًا كُلُّ عَشْرَةٍ مِنْهُ بِأَحَدٍ عَشَرَ

فَيَكُونُ رَأْسُ الْمَالِ عَشْرَةً وَالرُّبْعُ دِينَارًا)) [فتح الباری: ج ۴ ص ۵۱۳]

”یعنی اس میں کوئی حرج نہیں کہ جو چیز سود دینار کی خریدی ہے وہ اس طرح بیچے کہ ہر دس کے بدلے گیارہ دیناروں کا تو اصل مال دس دینار ہوئے اور ایک دینار نفع۔“

امام ثوری رحمہ اللہ امام شافعی رحمہ اللہ اہل الرائے اور ابن منذر کی رائے میں بھی یہ جائز ہے۔ [المغنی: ۶ ص ۲۶۶]

اس کے برعکس حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی رائے میں مراہجہ کی یہ صورت ناجائز ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

((بیع دہ دوازده ربا)) [مصنف عبدالرزاق: کتاب البیوع، باب بیع دہ دوازده]

”بیع دہ دوازده سود ہے۔“

اور عبداللہ بن ابی یزید کہتے ہیں:

((سمعت ابن عباس یکره بیع دہ دوازده قال وذاك بیع الاعاجم)) [السنن الکبریٰ للبیہقی و مصنف عبدالرزاق: کتاب البیوع، باب المراهجة]

”میں نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے سنا کہ وہ بیع دہ دوازده کو مکروہ سمجھتے تھے فرماتے تھے یہ عجمیوں کی بیع ہے۔ امام احمد نے بھی اس کو مکروہ کہا ہے اور امام اسحاق بن راہویہ کے خیال میں بھی یہ ناجائز ہے۔“

رائجہ رائے:

اگر فریقین کے دلائل کا موازنہ کیا جائے تو حسب ذیل وجوہ کے باعث ان بزرگوں کی رائے رائجہ معلوم ہوتی ہے جو اس کے حق میں ہیں۔

❁ قرآن وحدیث میں کوئی ایسی نص نہیں جو اس کی حرمت پر دلالت کرتی ہو۔ نیز اس سے کسی شرعی ضابطے کی خلاف ورزی بھی نہیں ہوتی۔

❁ پہلی قسم کی طرح اس میں بھی ہر چیز واضح ہے اصل لاگت بھی معلوم ہوتی ہے اور نفع بھی متعین ہے۔

❁ جہاں تک عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے آثار کا تعلق ہے ان کے

بارہ میں امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

((وہذا یحتمل ان یکون انما نہی عنہ إذا قال ہو لك بدہ یا زدہ أو قال بدہ دوازدہ لم یسم راس المال ثم سماہ عند النقد و كذلك ما روی عن ابن عمر فی ذلك)) [السنن الکبریٰ: کتاب البیوع، باب المرباحۃ]

”اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ممانعت تب ثابت ہے جب یہ کہے کہ یہ چیز میں تجھے اس طرح فروخت کرتا ہوں کہ ہر دس کے بدلے ایک یا ہر دس کے بدلے دو نفع لوں گا۔ اصل لاگت کا تذکرہ نہ کرے۔“

پھر ادائیگی کے وقت اس کی وضاحت کرے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کا بھی یہی مطلب ہے۔ یاد رہے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا اثر سنداً بھی ثابت نہیں کیونکہ اس کو سفیان بن عیینہ صینہ عن سے بیان کر رہے ہیں اور وہ مدلس ہیں۔

مراہجہ میں ضمنی اخراجات کا حکم:

یہاں یہ امر بھی قابل ملاحظہ ہے کہ بچی جانے والی چیز پر جو اخراجات آتے ہیں فروخت کنندہ ان کو بھی اصل لاگت میں شامل کر کے مجموعی لاگت پر نفع حاصل کرے گا۔ اوپر صحیح بخاری کے حوالے سے حضرت محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ فروخت کنندہ اخراجات پر بھی نفع لے سکتا ہے۔ شیخ الاسلام حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ رقم طراز ہیں:

((للبيع ان يحسب في المربحة جميع ما صرفه ويقول قام على بكذا)) [فتح الباری: ۴ ص ۵۱۳]

”مراہجہ میں بائع کو یہ بھی حق ہے کہ وہ تمام اخراجات کو شمار کر کے یہ کہے کہ یہ مجھے اتنے کی پڑی ہے۔“

بیع مراہجہ اور بدینکاری:

مذکورہ بالا تفصیل سے مراہجہ کا شرعی تصور اور اس کے اصول و مبادی نکھر کر سامنے آ گئے



ہیں اور یہ بھی واضح ہو گیا ہے کہ اس کا بینکاری کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ اسلامی بینکاری کے حامی مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

”یہ اصطلاح آج کل معاشی حلقوں میں ایک بینکاری کے طریقے کے طور پر مروج ہے۔ جبکہ مراہجہ کا اصل تصور اس خیال سے مختلف ہے۔ مراہجہ اصل میں اسلامی فقہ کی ایک اصطلاح ہے اور اس سے مراد ایک قسم کی بیع ہوتی ہے۔ جس کا اپنے اصل تصور کے اعتبار سے تمویل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔“ [اسلامی بینکاری کی بنیادیں: ص ۹۶]

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

”بنیادی طور پر مراہجہ طریقہ تمویل نہیں بلکہ بیع کی ایک خاص قسم ہے۔ شریعت کی رو سے تمویل کے مثالی طریقے ”مشاركه“ اور ”مضاربه“ ہیں۔“

آگے چل کے لکھتے ہیں:

”یہ بات کسی صورت نظر انداز نہیں ہونی چاہیے کہ مراہجہ اصل کے اعتبار سے طریقہ تمویل نہیں۔ یہ تو صرف سود سے بچنے کا ایک وسیلہ اور حیلہ ہے۔ ایسا مثالی ذریعہ تمویل نہیں جو اسلام کے معاشی مقصد کی تکمیل کرتا ہو۔“ [اسلامی بینکاری کی بنیادیں: ص ۱۰۸]

اسلامی بینکوں میں رائج مراہجہ:

اسلامی بینکوں میں رائج مراہجہ اصل میں ”المراہجۃ للامر بالشراء یا المرابحۃ للواعد بالشراء“ ہے۔ یعنی خریداری کا آرڈر دینے یا خریداری کا وعدہ کرنے والے کے ساتھ مراہجہ کا معاملہ کرنا اس کو مراہجہ مرکبہ بھی کہتے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کلائنٹ بینک سے درخواست کرتا ہے کہ آپ میرے لیے اس کوٹائی کی فلاں فلاں چیز خرید لیں میں وہ مراہجہ کی بنیاد پر آپ سے خرید لوں گا۔ شرح منافع کا تعین پہلے ہی ہو جاتا ہے۔ اور اس کا تعین شرح سود سے کیا جاتا ہے۔ عام طور پر بینک کلائنٹ کی دلچسپی جانچنے کے لیے ٹوکن منی (العامش الجدی) بھی وصول کرتا ہے پھر جب بینک حسب وعدہ مطلوبہ سامان خرید لیتا ہے تو باقاعدہ بیع کے ذریعے کلائنٹ کو فروخت کرتا ہے اور کلائنٹ عموماً

اپنے وعدے کے مطابق خریدنے کا پابند ہوتا ہے بعض دفعہ بینک پر بھی وعدے کی پابندی لازم ہوتی ہے لیکن عام طور پر بینک آزاد ہی ہوتا ہے۔ اگر بینک کے سامان خریدنے کے بعد کلائنٹ حسب وعدہ خریدنے سے انکار کر دے تو بینک وہ سامان کسی دوسرے کو بیچ دیتا ہے اور اصل لاگت سے جتنا خسارہ ہوتا ہے وہ وعدہ کرنے والے سے وصول کرتا ہے بینک چونکہ تجارتی ادارہ نہیں ہے اس لیے عام طور پر وہ خود سامان خریدنے کی بجائے اس کلائنٹ کو ہی خریداری کے لیے وکیل مقرر کر دیتا ہے کہ آپ یہ سامان خود خرید لیں اور اکثر کلائنٹ اپنا سپلائی بھی خود متعین کرتا ہے اور اس کا مطالبہ ہوتا ہے کہ بینک اسی سے مطلوبہ سامان خرید کر اسے فروخت کرے کلائنٹ کا بینک کے ساتھ یہ معاہدہ بھی ہوتا ہے کہ بیع کے بعد اگر اس نے وعدے کے مطابق ادائیگی نہ کی تو وہ اتنی رقم بینک کے زیر نگرانی قائم خیراتی فنڈ میں جمع کروائے گا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلامی بینکوں میں رائج مرابحہ قطعاً وہ نہیں جس کو ہمارے اسلاف نے جائز قرار دیا ہے بلکہ اس میں اور شرعی مرابحہ میں کئی اعتبار سے فرق ہے۔

❁ شرعی مرابحہ میں بیچا جانے والا سامان تاجر کے پاس پہلے سے موجود ہوتا ہے اس کے برعکس اسلامی بینکوں میں رائج مرابحہ میں مطلوبہ سامان بینک کے پاس موجود نہیں ہوتا۔

❁ شرعی مرابحہ میں چونکہ تاجر نے سامان خریداری کے آرڈر یا وعدہ کے بغیر خریدا ہوتا ہے اس لیے وہ حالات کے رحم و کرم پر ہوتا ہے ممکن ہے گا کہ فوراً آجائے اور یہ فروخت ہو جائے اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس کو طویل عرصہ تک انتظار کرنا پڑے اور یہ بھی خدشہ ہوتا ہے کہ اس عرصہ میں بازار میں چیز کی قیمت کم ہو جائے اور یہ نقصان اٹھا کر بیچنے پر مجبور ہو۔ اسلامی بینکوں میں رائج مرابحہ میں بینک کو یہ خطرات درپیش نہیں ہوتے۔

❁ شرعی مرابحہ ایک ہی مرحلہ میں مکمل ہو جاتا ہے۔ اس کے برخلاف اسلامی بینکوں میں

مروجہ مرابحہ دوم مرحلوں میں انجام پاتا ہے۔ پہلے مرحلہ میں وعدہ ہوتا ہے اور دوسرے مرحلہ میں عقد کی رسم ادا ہوتی ہے۔

❁ شرعی مرابحہ میں ادائیگی نقد بھی ہو سکتی ہے اودا ہار بھی لیکن بینکاری مرابحہ موجب ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ لوگ بینکوں میں جاتے ہی اس لیے ہیں کہ ان کے پاس رقوم نہیں ہوتیں۔

❁ شرعی مرابحہ کا معاملہ کرتے وقت سود فریقین کے وہم و خیال میں بھی نہیں ہوتا جبکہ اسلامی بینکوں میں نفع کا تعین ہی شرح سود سے ہوتا ہے۔

❁ شرعی مرابحہ میں صرف دو فریق ہوتے ہیں: (۱) بیچنے والا۔ (۲) خریدنے والا۔ اس کے برعکس یہاں ایک تیسرا فریق بینک بھی ہوتا ہے۔

مروجہ مرابحہ کا شرعی حکم:

یہ صورت چونکہ شرعی مرابحہ سے بالکل مختلف ہے اس لیے اس کو شرعی مرابحہ کی بنیاد پر جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس کا جواز اس بات پر موقوف ہے کہ یہ پوری طرح شرعی اصول سے ہم آہنگ ہے یا نہیں؟

ذیل میں ہم شرعی اصول کی روشنی میں اس کی مختلف صورتوں کا الگ الگ حکم بیان کرتے ہیں۔

❁ اگر بینک کیساتھ کیے ہوئے وعدہ کی پابندی فریقین کے لیے لازمی ہو کہ بینک ہر صورت سامان دینے اور کلائنٹ خریدنے کا پابند تو یہ صورت عملاً بیع ہی کی ہے جو شرعی اصول سے متصادم ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے۔

چنانچہ ڈاکٹر شیخ محمد سلیمان الاشقر لکھتے ہیں:

((وإذا تم هذا فان الاتفاق في الحقيقة هو عقد لان ما فيه من

اتفاق ارادتين على انشاء حق فهو عقد بلاريب ولو سمي

وعداً فهو عقد ايضاً فاذا جبرى الاتفاق على هذه الطريقة فهو عقد

باطل و حرام لاسباب)) [بحوث فقیہہ فی قضاء

اقتصادیہ معاصرہ: ج ۱ ص ۸۲]

”جب یہ معاملہ پورا ہو جائے تو یقیناً یہ ایگرمنٹ درحقیقت عقد ہے کیوں کہ اس ایک حق کو وجود میں لانے کا جو دو ارادوں پر اتفاق ہے وہ بلاشبہ عقد ہے اگرچہ اسے وعدے کا نام بھی دیا جائے پھر بھی یہ عقد ہے جب ایگرمنٹ اس طریقے کے مطابق پورا ہو تو وہ چند اسباب کی بناء پر باطل اور حرام ہے۔“

وہ کون سے شرعی اسباب ہیں جن کی بنیاد پر یہ عقد حرام قرار پاتا ہے اس کی وضاحت میں شیخ اشقر فرماتے ہیں:

✽ اس کی حرمت کا پہلا سبب یہ ہے کہ بینک کلائنٹ کو ایک ایسی چیز بیچ رہا ہے جو ابھی تک اس کی ملکیت نہیں حالانکہ نبی ﷺ نے اس چیز کی بیچ کی ممانعت فرمائی ہے جو قبضے میں نہ ہو۔ اور آپ ﷺ نے اس بیع سے بھی منع فرمایا ہے کہ ایسی چیز آگے بچی جائے جو انسان کے پاس موجود نہ ہو۔

✽ بینک نے معلق بیع کی ہے کیوں کہ کلائنٹ بینک سے یہ کہتا ہے کہ اگر تم اس کو خرید لو تو میں تم سے لے لوں گا جبکہ بیع معلق صحیح نہیں ہے۔

✽ اس کی حرمت کا تیسرا سبب یہ ہے کہ یہ سود پر قرض دینے کا حیلہ ہے۔

✽ اگر بچی جانے والی چیز کا تعلق غذائی اشیاء سے ہو تو اس میں ممانعت کا چوتھا سبب بھی شامل ہو جاتا ہے۔ جس کی طرف ابن عبدالبر نے اشارہ کیا ہے کہ نبی ﷺ نے طعام کی بیع سے منع فرمایا حتیٰ کہ تاجرا سے اٹھا کر اپنے ٹھکانوں پر لے جائیں۔ [بحوث فقیہہ

فی قضایا اقتصادیہ معاصرہ: ج ۱ ص ۷۲۷۳]

علاوہ ازیں یہ آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کے بھی مخالف ہے۔

((البیعان بالخیار مالم یتفرقا)) [صحیح بخاری: کتاب البیوع، باب

کم یحوز الخیار]

”الگ ہونے تک بائع مشتری دونوں کو اختیار ہوتا ہے۔“

لیکن بینک میں مروجہ مراجمہ میں یہ اختیار سلب کر لیا جاتا ہے۔
امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

((وإذا أرى الرجل الرجل السعلة فقال اشتر هذه وأربحك فيها كذا فاشترها الرجل فالشراء جائز والذي قال أربحك فيها بالخيار إن شاء أحدث فيها بيعا وإن شاء تركه وهكذا إن قال اشتر لي متاعا ووصفه له أو متاعا أي متاع شئت وأنا أربحك فيه فكل هذا سواء يحوز البيع الاول ويكون هذا فيما أعطى من نفسه بالخيار)) [كتاب الام: ج ۳ ص ۳۹]

”جب ایک شخص دوسرے کو کوئی چیز دکھا کر یہ کہے کہ یہ خرید لیں میں آپ کو اتنا منافع دوں گا اس پر وہ شخص وہ چیز خرید لے تو یہ خریداری جائز ہوگی۔ تاہم جس نے یہ کہا تھا کہ میں اتنا نفع دے دوں گا اس کو اختیار ہے اگر چاہے تو بیع کرے اور اگر چاہے تو چھوڑ دے۔ اور اسی طرح اگر یہ کہے کہ میرے لیے فلاں قسم کا سامان خرید لو یا یہ کہے کہ جو سامان تم چاہو وہ خرید لو میں آپ کو اس میں اتنا نفع دوں گا تو پہلی بیع جائز ہوگی اور آڈر دینے والے کو اختیار ہوگا۔“

مزید لکھتے ہیں:

((وإن تباعا به على أن ألزما أنفسهما الأمر الاول فهو مفسوخ من قبل شيئين أحدهما أنه تباعا قبل يملكه البائع والثاني أنه على مخاطرة أنك إن اشتريته على كذا أربحك فيه كذا))
”اگر دونوں اس چیز کی اس طرح بیع کریں کہ وہ دونوں پہلے آڈر کو لازم سمجھیں تو یہ دو وجہ سے فسخ ہوگی۔

(۱) دونوں نے چیز ملکیت میں آنے سے پہلے بیع کی ہے۔

(۲) اس میں رسک ہے کہ یہ کتنا اس نے کہا ہے کہ اگر آپ اتنے کی خرید لیں تو میں آپ کو اتنا نفع دوں گا۔“ [حوالہ مذکورہ]

نیز یہ بیع الکالی بالکالی کی قبیل سے ہے کیونکہ بینک نے سامان بعد میں دینا ہے۔ اور کلائنٹ نے قیمت بعد میں ادا کرنی ہے۔ شرعی طور پر یہ بھی ممنوع ہے۔

((أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى عَنْ بَيْعِ الْكَالِيِّ بِالْكَالِيِّ))

[سنن دارقطنی: ۳۱۰۵]

”بلاشبہ نبی ﷺ نے ادھار کے بدلے ادھار بیع سے منع فرمایا ہے۔“

امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ روایت تو ضعیف ہے لیکن اس مسئلہ پر اجماع ہے کہ ادھار کی ادھار کے بدلے بیع جائز نہیں۔ [نیل الاوطار: ج ۸، ص ۲۱۳]

مالکی فقہاء نے مکروہ بیع کی ایک صورت یہ بھی ذکر کی ہے کہ آدمی کسی دوسرے سے یہ کہے کہ آپ کہ پاس فلاں فلاں چیز ہے جو آپ مجھے ادھار بیچ دیں وہ جواب دے کہ نہیں اس پر یہ کہے کہ یہ آپ خرید لیں میں آپ سے منافع پر ادھار خرید لوں گا اس پر وہ چیز خرید کر اپنے وعدے کے مطابق بیچ دے۔ [الموسوعة الفقهية الكويتية بحوالہ مواجب الحلیل للحطاب البیان والتحصيل لابن رشد]

اسلامی بینک کاری کے ماہر ڈاکٹر رفیق یونس مصری لکھتے ہیں:

((فإذا لم يكن هناك خيار فانها لا تجوز لان المواعدة الملزمة في بيع المراجعة تشبه البيع نفسه حيث يشترط عندئذ ان يكون البائع مالكا للمبيع حتى لا تكون هناك مخالفة لنهي النبي ان يبيع الانسان ما ليس عنده فالمرابحة ظاهرها البيع وباطنها التمويل فانها لا تجوز)) [المصارف الاسلامية: ص ۳۳]

”جب اختیار نہ ہو تو معاملہ جائز نہیں کیوں کہ بیع مراہقہ میں لازمی وعدہ نفس بیع کے مشابہہ ہے جب بیع میں یہ شرط ہے کہ فروخت کنندہ بیچی جانے والی چیز کا مالک ہو۔ تو نبی ﷺ کہ اس فرمان کہ ”جو انسان کے پاس نہیں وہ بیچنا منع ہے۔“ کی مخالفت نہ ہو۔ چنانچہ وعدہ غیر لازمی ہو تو مراہقہ جائز ہے لیکن جب مراہقہ کا ظاہری مطلب بیع

ہو اور حقیقت میں فنا سنگ ہو تو یہ جائز نہیں۔“

شیخ بکر بن عبد اللہ ابوزید رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((فكيف يجوز للمصرف ان يبيع ما لم يملك اصلاً و يوافق و يربح فيه فملكه تقدیری لا حقیقی استیلاءه علیه تقدیری لا حقیقی

فالمنع من هذا يكون باب الاولى)) [فقہ النوازل : ج ۲ ص ۹۳]

”بینک کے لیے یہ کیسے جائز ہے کہ وہ ایک ایسی چیز بیچے کہ جس کا وہ بالکل ہی مالک نہیں ہے وہ سودا حاصل کر کے نفع حاصل کرتا ہے حالانکہ وہ چیز اسکی تقدیری ملکیت میں ہے نہ کہ حقیقی۔ چنانچہ اس کی ممانعت بدرجہ اولیٰ ہونی چاہیے۔“

ڈاکٹر احمد ریان لکھتے ہیں:

((هذا العقد تكتنفه مجموعة من المحاذير الفقهية التي من أهمها: ان الوعد من العميل بالشراء، وموافقة المصرف على ذلك؛ هو عقد حتى وان كسب في الاوراق انه وعد، لان العبرة بالمعاني وليست بالمباني كما يقول الفقهاء، وبما انه عقد فيشترط له توفر كافة شروط عقد البيع، واكثرها غير متوفرة فيه)) [فقہ البيوع المنهى عنها مع تطبيقاتها الحديثة في المصارف الاسلامية: ص ۴۴]

”اس عقد کو متعدد فقہی خرابیوں نے گھیرا ہوا ہے ان میں سے سب سے اہم یہ ہے کہ کلائنٹ کی طرف سے خریداری کا وعدہ اور بینک کی اس پر موافقت عقد ہے۔ اگرچہ کاغذات میں اس کو وعدہ لکھا جاتا ہے۔ کیونکہ فقہاء کے قول کے مطابق حقائق کا اعتبار کیا جاتا ہے نہ کہ الفاظ کا۔ اور جب یہ عقد ہے تو اس میں عقد بیع کی تمام شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے اور ان میں اکثر یہاں نہیں پائی جاتیں۔“

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھیے کہ اس میں منافع کے لیے شرح سود کو معیار بنانے سے یہ معاملہ مزید مشکوک ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اسلامی بینک کاری کے حامی بھی اس کو

پسندیدہ قرار نہیں دیتے چنانچہ مولانا تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

”اس میں کوئی شک نہیں کہ حلال منافع کے تعین کے لیے سود کی شرح کا استعمال پسندیدہ نہیں اور اس سے یہ معاملہ کم از کم ظاہری طور پر سودی قرض کے مشابہ بن جاتا ہے اور سود کی شدید حرمت کے پیش نظر اس ظاہری مشابہت سے بھی جہاں تک ہو سکے چٹنا چاہیے۔“ [اسلامی بینکاری کی بنیادیں: ص ۱۲۴]

مزید لکھتے ہیں:

”البتہ یہ بات درست ہے کہ اسلامی بینکوں اور مالیاتی اداروں کو جتنا جلدی ممکن ہو اس طریقہ کار سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے۔ اس طرح کہ اول تو اس میں شرح سود کو حلال کا رد بار کے لیے مثالی اور معیاری سمجھ لیا جاتا ہے جو کہ پسندیدہ بات نہیں دوسرے اس لیے کہ اس سے اسلامی معیشت کے بنیادی فلسفے کو فروغ نہیں ملتا۔ اس لیے کہ اس سے تقسیم دولت کے نظام پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔“ [اسلامی بینکاری کی بنیادیں: ص ۱۲۵]

✽ اس معاملے کی دوسری صورت یہ ہے کہ وعدہ یک طرفہ ہو یعنی گاہک اپنے وعدے کا پابند ہو لیکن بینک آزاد ہو یہ صورت بھی درست نہیں کیونکہ نبی ﷺ کے ارشاد ”البيعان بالخيار“ میں بیچنے والے خریدنے والے دونوں کو اختیار دیا گیا ہے ایک کو پابند اور دوسرے کو مستثنیٰ رکھنا اس تفریق کی کوئی اصل نہیں چنانچہ ڈاکٹر رفیق یونس مصری لکھتے ہیں:

((انی اری ضرورة الخيار لكل المتواعدین اما الخيار لاحدهما فقط
فهو تحکم)) [تعليق مصارف الاسلامية: ص ۳۲]

”میری رائے میں دونوں کو اختیار ضروری ہے فقط ایک کو اختیار سینہ زوری ہے۔“

✽ اس معاملے کی تیسری صورت یہ ہے کہ کلائنٹ اور بینک دونوں پابند نہ ہوں بینک کے چیز خریدنے کے بعد کلائنٹ کو بیع کرنے اور نہ کرنے دونوں کا اختیار ہو اس طرح بینک بھی اپنے فیصلے میں آزاد ہو تو یہ صورت جائز ہوگی لیکن جیسا کہ مولانا تقی عثمانی کے

حوالے سے بیان ہوا ہے کہ شرح سود کو معیار بنانے کی وجہ سے یہ معاملہ سودی قرض کے مشابہ بن جاتا ہے اس لیے اس سے بچنا ہی بہتر ہے۔ اس موقع پر ڈاکٹر محمد سلیمان اشقر کے فتویٰ کا ذکر بھی مفید رہے گا۔

((نظام البيع المربحة كما تحريه بعض البنوك الاسلامية في الوقت الرهن نظام غير جائز وهو تحايل على الربا او هو بيع السلعة من البنك قبل امتلاكها وكلاهما ممنوع شرعاً والسنة النبوية تمنع هذا البيع وان المذاهب الاربعة كلها تقول بانه ومحرم وخاصة مذهب المالكية الذي ينص نصاً صريحاً على منعه والذين قالوا في مؤتمر البنك الاسلامي بدعي بجوازه غلطوا على الفقه الاسلامي غلطاً كبيراً وانه لا مستند لهم في ما قالوا))

[بحوث فقيهة في قضايا اقتصادية معاصرة: ج ۱ ص ۱۱۳، ۱۱۵]

”بیع مربحہ کا نظام جس کو دور حاضر میں بعض اسلامی بینک جاری کیے ہوئے ہیں ناجائز ہے اور یہ سود کے حاصل کرنے کا حیلہ ہے یا یہ بینک کی طرف سے ایسی چیز کی بیع ہے جو ابھی اس کی ملکیت میں نہیں آئی اور دونوں شرعاً ممنوع ہیں اور سنت نبوی ﷺ اس بیع کی اجازت نہیں دیتی بلاشبہ مذہب اربعہ اس کو حرام قرار دیتے ہیں خاص طور پر مالکیوں کا مذہب جس نے اس ممانعت کی واضح طور پر صراحت کی ہے اور جنھوں نے دوسری میں اسلامی بینک کی کانفرنس میں اس کو جائز قرار دیا۔ انھوں نے فقہ اسلامی کے ذمے بہت بڑی غلطی لگائی اور ان کے پاس اپنی تائید میں کوئی دلیل نہیں ہے۔“

اسلامی بینکوں کا نقطہ نظر:

اسلامی بینکوں کی طرف سے اس کے حق میں سب سے بڑی دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ حقیقی بیع تب ہوتی ہے جب بینک مطلوبہ سامان خرید لیتا ہے اس سے پہلے صرف بیع کا وعدہ ہوتا ہے۔ لہذا اس سے اوپر بیان شدہ خرابیاں لازم نہیں آتیں۔ بیع اور وعدہ میں فرق

ہے مثلاً بینک کی طرف سے مطلوبہ چیز خریدنے کے بعد اور کلائنٹ کے حوالے کرنے سے پہلے اگر وہ ضائع ہو جائے تو بینک کا نقصان ہوگا اسی طرح اگر بینک کی طرف سے خریداری کے بعد کلائنٹ انکار کر دے تو بینک اس کو کسی دوسرے شخص کو بیچ کر الگ لاگت سے جتنے پیسے کم ملیں گے وہ وعدہ کرنے والے سے وصول کرے گا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ باقاعدہ بیع نہیں ہے ورنہ نہ تو بینک نقصان کا ضامن ہوتا اور نہ ہی اس کو دوسری جگہ بیچنے کا اختیار ہوتا لیکن اگر غور کیا جائے تو دو وجہ سے یہ دلیل انتہائی کمزور ہے۔

۱۔ ہم پیچھے بیان کر آئے ہیں کہ لازمی وعدہ بیع ہی کی شکل ہے یہی وجہ ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ اور مالکی فقہاء نے ”مرا بحة للامر بالشراء“ کی جس شکل میں اختیار نہ ہو کو ناجائز قرار دیا ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے۔ فقہائے احناف کے سرخیل حضرت امام محمد رحمہ اللہ نے اس خطرہ کے پیش نظر کہ ”آرڈر دینے والا خریدنے سے انکار نہ کرے“ کے لیے یہ حیلہ تجویز کیا ہے کہ جس کو آرڈر دیا گیا ہے وہ اس شرط پر خریدے کہ مجھے تین دن بعد واپس کرنے کا اختیار ہے اگر آرڈر دینے والا اپنے وعدے کے مطابق خرید لے تو اس کے حوالے کر دے۔ اگر اس کو دلچسپی نہ ہو تو اس اختیار کی بناء پر واپس کر کے نقصان سے محفوظ رہے گا۔ [کتاب الحیل امام محمد بنحو الہ بحوث فقیہہ فی قضایا اقتصادیہ معاصرہ: ج ۱ ص ۱۰۲، ۱۰۳]

یہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ فقہاء احناف کے ہاں مرا بحة میں وعدہ پورا کرنا قانونی ذمہ داری نہیں ورنہ اس حیلے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

باقی رہ گیا وہ فرق جو اسلامی بینکوں کی جانب سے بیان کیا جاتا ہے تو اس سے معاملے کی حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہے وہ یہ کہ فریقین وعدے کے مطابق بیع کرنے کے پابند ہیں۔

۲۔ اس دلیل کی کمزوری کی دوسری وجہ یہ ہے کہ جن آئمہ نے ایفاء وعدہ کو فرض کہا ہے۔ وہ تبرعات کے بارہ میں ہے نہ کہ معاوضات میں۔ بعض دفعہ یہ بھی ہوتا ہے کہ مشتری چیز

خرید کر بل بینک کے حوالے کرتا ہے بینک کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ اس میں درج رقم ادا کر کے اس پر نفع وصول کرے۔ اس کو مراہجہ کا نام دے دیا جاتا ہے حالانکہ اس کا مراہجہ سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ سراسر سودی حیلہ ہے۔

یہی وجہ کہ بیج مراہجہ کی بنیاد پر بینکاری کا نظریہ دم توڑ رہا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر رفیق یونس مصری لکھتے ہیں:

((وتجدد الاشارة الى ان نجم بيع المراهجه للامر بالشراء عند الافراد والعلماء والهيئات والمجامع آخذ في الاخمال بل ان بعض العلماء كالشيخ مصطفى الزرقاء قد غير رأيه تغيراً جذرياً كما اعلن ذلك يوم الخميس)) [٩١٧-١٤١٤ في ندوة البركة، ص: ٣٣]

”یہاں اس بات کی طرف اشارہ بھی مناسب رہے گا کہ ماہرین علماء اور مختلف کونسلوں اور اکیڈمیوں کے نزدیک خریداری کا آرڈر دینے والے کیساتھ بیج مراہجہ کا معاملہ کرنے کا ستارہ ڈوب رہا ہے۔ بلکہ بعض علماء نے جیسا کہ شیخ محمد مصطفیٰ زرقاء ہیں کلیتاً اپنی رائے کو تبدیل کر لیا ہے جیسا کہ انہوں نے ۱۴۱۴ھ-۲۰۰۹ء بروز جمعرات برکہ سیمینار میں اعلان کیا۔“

اجارہ مُنتَهِيَةٌ بِالتَّمْلِيكِ:

یہ بھی اسلامی بینکوں میں فنانسنگ کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ اجارہ کی یہ صورت اسلامی بینکاری کی ایجاد کردہ ہے۔ ہمارے واجب الاحترام محدثین وفقہاء اس سے واقف نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کتب میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ لہذا ہم بھی اس کے احکام جاننے کے لیے اسلامی بینکوں کی رہنمائی کے لیے مرتب کردہ شریعہ سینٹرڈ ریز پر ہی اعتماد کریں گے۔ چنانچہ شریعہ سینٹرڈ ریز کے سکالرز نے اس کی تعریف یوں کی ہے۔

((هـى اجارة يقترون بها الوعد بتملك العين المؤجرة الى المستأجر

فى نهاية مدة الاجارة اوفى اثنائها)) [المعايير الشرعية: ص ۱۵۳]

”ایسا اجارہ جس میں یہ وعدہ شامل ہو کہ مدت اجارہ کے آخر میں یا اس کے دوران ہی کرائے پر دی گئی چیز کی ملکیت کرایہ دار کی طرف منتقل کر دی جائے گی۔“
ڈاکٹر وہبہ زحیلی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

((ہی تمليك منفعة بعض الاعيان كاللورو المعدات مدة معينة من الزمن باجرة معلومة تزيد عادة عن اجرة المثل وعلى ان يملك الموجد العين الموحدة للمستاجر بناء على وعد سابق بتملكها في نهاية المدة او في اثنائها بعد سداد جميع مستحقات الاجرة او اقساطها وذلك بعقد جديد)) [المعاملات المالية المعاصرة: ص ۳۹۴]

”اجارہ منتهیہ بالتملیک کا مطلب ہے کہ متعین وقت کے لیے طے شدہ کرائے جو عام طور پر اس طرح کی دوسری چیزوں کے کرائے سے زیادہ ہوتا ہے کہ بدلے کسی چیز جیسے گھر یا سامان کے فائدے کا دوسرے کو مالک بنا دینا اس شرط پر کہ کرایہ کی تمام قسطیں ادا کرنے کے بعد مدت کرایہ کے اختتام پر یا اس کے دوران ہی مالک سابق وعدے کی بنیاد پر ایک نئے عقد کے ذریعے اس چیز کی ملکیت کرایہ دار کی طرف منتقل کر دے گا۔“

شرعی اجارہ اس سے مختلف ہے۔ اسلامی بینکاری کے حامی بھی اس بات کے قائل ہیں کہ شریعت نے اجارہ کا جو تصور دیا ہے وہ اس سے مختلف ہے چنانچہ ڈاکٹر وہبہ زحیلی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: اجارہ ”منتهیہ بالتملیک“ عام اجارہ سے دو لحاظ سے مختلف ہے:

۱۔ اجارہ ”منتهیہ بالتملیک“ دو مستقل عقدوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ پہلا عقد اجارہ جو طے شدہ مدت تک جاری رہتا ہے دوسرا مدت کے اختتام یا دوران مدت اس چیز کو مالک بنانے کا عقد۔

۲۔ اجارہ ”منتهیہ بالتملیک“ میں بینک کرائے پر دی جانے والی چیز کلائنٹ کی درخواست کے بعد خریدتا ہے اکثر اس کا کرایہ عام کرایہ سے زیادہ ہوتا ہے جبکہ عام اجارہ میں وہ چیز

پہلے سے موجد کے پاس موجود ہوتی ہے۔ [المعاملات المالية المعاصرة و ہبہ زحیلی: ص ۳۹۵]

اسلامی بینکوں میں رائج اجارہ اور سودی بینکوں میں رائج ہائر پر چیز میں فرق: اسلامی بینکوں کے نقطہ نظر کے مطابق دونوں میں فرق اس طرح ہے کہ ہائر پر چیز میں بیع اور اجارہ دونوں عقد بیک وقت شروع ہوتے ہیں آخری قسط کی ادائیگی پر مستقل عقد کے بغیر ہی چیز کی ملکیت مستاجر کی طرف منتقل ہو جاتی ہے جبکہ اجارہ منتهیۃ بالتملیک میں مدت اجارہ کے ختم ہونے تک اجارہ کے احکام نافذ ہوتے ہیں اسکے بعد ملکیت مستاجر کی طرف منتقل ہوتی ہے۔ [المعايير الشرعية: ۱۴۶]

اسی طرح اجارہ ”منتهیۃ بالتملیک“ اور بیع قسط میں بھی فرق ہے۔ بیع قسط میں عقد شروع میں ہی مکمل ہو جاتا ہے صرف قیمت قسطوں کی صورت میں ادا کی جاتی ہے جبکہ مذکورہ بالا اجارہ میں دو عقد ہوتے ہیں پہلے عقد اجارہ کی مدت پوری ہونے کے بعد ایک نیا عقد بیع۔ [المعاملات المالية المعاصرة للدكتور و ہبہ الزحیلی: ۳۹۵، ۳۹۶]

ملکیت منتقل ہونے کے طریقے:

”المعايير الشرعية“ میں اس کی تین صورتیں بیان ہوئی ہیں۔

- ۱۔ رسمی یا حقیقی قیمت کے بدلے بیع کا وعدہ ہو یا مدت اجارہ کے دوران ہی باقی مدت کے کرائے کے بدلے یا مارکیٹ ریٹ کے مطابق بیع کا وعدہ ہو۔
- ۲۔ ہبہ کا وعدہ ہو۔

- ۳۔ ہبہ کا عقد ہو جو تمام اقساط کی ادائیگی کی شرط پر معلق ہو۔ [ص ۱۴۱] البتہ یہ فیصلہ کرنا شروع میں ضروری ہے کہ کون سا طریقہ اختیار کیا جائیگا۔ ”المعايير الشرعية“ میں یہ بھی صراحت ہے کہ یہ وعدہ موجد (بینک) کی طرف سے ہوگا۔ مزید لکھا ہے کہ یہ وعدہ یک طرفہ ہوگا اور مؤجر (بینک) پر اس کی پابندی لازم ہوگی۔ [ص ۱۴۲]
- یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ بینک جس پر چیز پر اجارہ کرتا ہے وہ پہلے

سے بینک کے پاس موجود نہیں ہوتی بلکہ وہ کلائنٹ کی درخواست پر خریدتا ہے۔ اس میں یہ امکان بھی ہوتا ہے کہ بینک جب وہ چیز خرید لے تو کلائنٹ لینے سے انکار کر دے ظاہر ہے اس صورت میں بینک کے لیے یہ خسارے کا سودا ہوگا۔ اسلامی بینکوں نے اس خطرے کا یہ حل نکالا ہے کہ وہ کلائنٹ سے متعلقہ چیز کی قیمت کا دس فیصد پہلے وصول کر لیے ہیں اسکو ”ضمانِ جدیدہ“ کہتے ہیں۔ تاکہ اگر کلائنٹ بینک کی خریداری کے بعد اپنی بات پر قائم نہ رہ سکے تو بینک کا نقصان نہ ہو اس صورت میں بینک اس کا معاملہ کسی دوسرے کے ساتھ کرے گا اور جتنا نقصان ہوگا وہ ضمانِ جدیدہ سے پورا کرے گا۔ اگر ضمانِ جدیدہ کی رقم نقصان کی تلافی کیلئے ناکافی ہو تو وہ کلائنٹ سے مزید مطالبہ بھی کر سکتا ہے کیونکہ بینک کو یہ نقصان اس کی وجہ سے ہوا ہے اگر ضمانِ جدیدہ سے نقصان پورا کرنے کے بعد کچھ رقم بچ جائے تو وہ کلائنٹ کی ہو گی۔ شرعی اجارہ میں یہ نہیں ہوتا بلکہ اس میں وہ چیز مالک نے کسی کی درخواست کے بغیر خود خریدی ہوتی ہے اس میں یہ بھی امکان ہوتا ہے کہ کوئی کرایہ پر لینے کے لیے آجائے یا نہ آئے۔ اس سے بھی ہمارے اس موقف کو تقویت ملتی ہے کہ اسلامی بینک نان رسک ادارہ ہے۔

ضَمَانِ جَدِيدَہ کا حکم:

”المعايير الشرعية“ کے نقطہ نظر کے مطابق یہ رقم یا تو بینک کے پاس حفاظت کی غرض سے رکھی امانت تصور ہوگی۔ بینک اس میں تصرف کا مجاز نہیں ہوگا یا اسکی حیثیت اس امانت کی ہوگی جو سرمایہ کاری کے لیے دی جاتی ہے یعنی کلائنٹ بینک کو اجازت دے گا کہ وہ اس رقم سے مضاربہ کی بنیاد پر سرمایہ کاری کرے اور یہ بھی جائز نہیں ہے کہ جب اجارہ کا باقاعدہ عقد ہو اس وقت یہ طے کر لیا جائے کہ رقم اجرت کی قسطوں میں شمار ہوگی۔ [ص ۱۳۴]

اگر چیز تباہ ہو جائے یا قابل استعمال نہ رہے؟

اس بارے میں شریعہ سنینڈرڈز کا موقف بڑا واضح ہے کہ اگر اس میں مستاجر کا عمل دخل نہ ہو تو دونوں حالتوں میں اجرتِ مثل (مارکیٹ کرایہ) کی طرف لوٹا جائے گا۔ اور عقد میں طے شدہ کرایہ کے مطابق بینک نے اجرتِ مثل سے جتنا زیادہ لیا ہوگا وہ مستاجر

کو واپس کرنے کا پابند ہوگا۔ [ص ۱۴۲]

اجارہ ”منتہیۃ بالتملیک“ کا شرعی حکم:

ڈاکٹر احمد ریان اسلامی بینکوں میں رائج اجارہ کی مروجہ صورتوں میں پائی جانے والی خرابیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

✽ اس میں بیع کا عقد معلق ہوتا ہے یہ ایسی خرابی ہے جس کی ممانعت پر تمام فقہاء متفق ہیں۔

✽ عقد میں شرط پائی جاتی ہے بعض فقہاء کے نزدیک یہ بھی ممنوع ہے۔

✽ یہ معاملہ ایک عقد میں دو عقدوں پر مشتمل ہوتا ہے یعنی ایک بیع میں دو بیعوں کی ممانعت میں داخل ہے۔ [فقہ البیوع المنہی عنہا مع تطبیقاتہا الحدیثۃ فی المصارف الاسلامیۃ]

علاوہ ازیں اس میں حسب ذیل خرابیاں بھی پائی جاتی ہیں:

✽ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ عقد اجارہ کے وقت ہی بینک یہ وعدہ کرتا ہے کہ مدت اجارہ ختم ہونے پر رسی یا حقیقی قیمت کے عوض یا مدت اجارہ کے دوران ہی باقی قسطوں کے بدلے یا بازاری قیمت پر یہ چیز مستاجر کی ملکیت میں دے دے گا۔ ڈاکٹر محمد زحلی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

((اما ان كان الوعد ملزما فيدخل في معاملات محرمة شرعا

وهی بیع ما لا یملک والبیع قبل القبض بل قبل الشراء))

[المصارف الاسلامیۃ: ص ۷۷، ۷۸]

”اگر وعدہ لازمی ہو تو یہ شرعی طور پر حرام معاملات میں داخل ہو جائے گا۔ وہ ہیں غیر ملکیتی چیز اور قبضہ سے پہلے بلکہ خریدنے سے پہلے ہی بیع کا معاملہ۔“

یا ہبہ کرنے کا وعدہ ہوتا ہے یا تمام اقساط کی ادائیگی سے مشروط ہبہ کا عقد ہوتا ہے۔ جو صورت بھی ہو وہ غرر سے خالی نہیں۔ کیونکہ ایسا وعدہ بیع جس کی پابندی لازم ہو عملاً بیع ہی

ہے۔ اسلامی بینکنگ کے حامیوں کا یہ کہنا کہ یہ یکطرفہ وعدہ ہے جس میں ایک فریق کو اختیار ہے تو بقول ڈاکٹر رفیق یونس مصری کے صرف ایک کو اختیار دینا سیدہ زوری ہے۔ جب یہ بیع ہی ہے تو عقد بیع کے وقت قیمت مجہول ہوتی ہے کیا علم کہ پانچ سال بعد حقیقی قیمت کیا ہوگی یا رکی قیمت کیا مقرر ہوگی اور یہ بھی احتمال ہوتا ہے کہ متاجر مکمل قسطیں ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے اس کے ملکیتی حقوق حاصل نہ کر سکے۔ اس کو بہہ کا عقد کہنا بھی درست نہیں کیونکہ مستقبل کی شرط پر معلق بہہ درست نہیں ہوتا جیسا کہ شیخ صالح بن فوزان رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

((ولا تصح الهبة المعلقة على شرط مستقبل كان يقول اذا

حصل كذا فقد وهبتك كذا)) [الملخص الفقہی: ۲، ص ۱۱۵]

”مستقبل کی شرط پر معلق بہہ صحیح نہیں ہے۔ جیسے یہ کہے کہ جب اس قسم کی چیز حاصل ہو گی تو میں فلاں چیز آپ کو بہہ کر دوں گا۔“

ایسے ہی اس کو بہہ کا وعدہ کہنا بھی درست نہیں کیونکہ اس صورت میں یہ ایسا بہہ ہوگا کہ مارکیٹ ریٹ سے زیادہ کرایہ وصول کرنے کی صورت میں جس کا بدلہ لیا جاتا ہے۔ اس قسم کا بہہ بھی بیع ہی کے حکم میں ہوتا ہے سوائے اس کے کہ اس میں معاوضہ اور اس کی مقدار طے نہیں ہوتی۔

✽ اس کی عملی تطبیق میں بھی گڑبڑ ہوتی ہے۔ وہ یوں کہ بینک اس مدت کا کرایہ بھی قسطوں میں ایڈجسٹ کرتا ہے جس میں گاڑی تو کلائنٹ کو نہیں ملی ہوتی لیکن بینک بکنگ کے لیے رقم جمع کروا چکا ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم پیچھے اسلامی بینکاری کے سکالر جناب محمد ایوب کے حوالے سے لکھ آئے ہیں۔

✽ اس میں شریعہ سینڈرڈز کے احکام کی بھی خلاف ورزی پائی جاتی ہے۔

* شریعہ سینڈرڈز کے مطابق بیع کا وعدہ بینک کی جانب سے ہونا چاہیے جبکہ اسلامی بینک کلائنٹ سے وعدہ لیتے ہیں۔

* شریعہ سینڈرڈز کے مطابق بینک ضمان جدید سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اس کے برعکس

اسلامی بینک کرنٹ اکاؤنٹ کی صورت میں اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ بلکہ یہ بھی رپورٹیں ہیں کہ بعض اسلامی بینک ضمان جدیدہ کو اسٹیٹ بینک کے پاس ریزروکیش ریکوائرمنٹ کے طور پر بھی جمع کرواتے ہیں۔

* شریعہ سینڈرڈز کی رائے میں اجارہ پردی ہوئی چیز اگر تباہ ہو جائے یا وہ باقی ماندہ مدت کے لیے قابل استعمال نہ رہے بشرطیکہ اس میں مستاجر کا عمل دخل نہ ہو تو بازاری قیمت سے زائد لیا ہوا کرایہ مستاجر کو واپس کیا جانا چاہیے لیکن اسلامی بینکوں میں اس پر عمل نہیں ہوتا بلکہ ان کا طریقہ یہ ہے کہ انشورنس یا تکافل کمپنی سے جو رقم ملتی ہے اس میں سے پہلے اپنی باقی ماندہ رقم پوری کرتے ہیں۔ اگر کچھ بچ جائے تو مستاجر کو دیتے ہیں ورنہ اللہ اللہ خیر سلا۔ اسلامی بینکوں کا یہ عمل اگلے اپنے ہی شریعہ سینڈرڈز کے خلاف ہے۔

مشارکہ متناقصہ (Diminishing Musharakah):

اس کو شرکہ متناقصہ بھی کہتے ہیں اس کا معنی ہے تخفیف پذیر مشارکہ یعنی وہ مشارکہ جس میں ایک فریق اپنا حصہ وقفے وقفے سے دوسرے فریق کو بیچتا جاتا ہے بالآخر دوسرے فریق کلی طور پر اثاثے کا مالک بن جاتا ہے۔ اسلامی بینکوں میں اس پر بھی بکثرت عمل ہوتا ہے اس کو زیادہ تر ہاؤس فنانسنگ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اجارہ ”منتہیۃ بالتملیک“ کی طرح یہ اصطلاح بھی اسلامی بینکاری نے ہی متعارف کروائی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا سب سے پہلے استعمال مصر میں

شروع ہوا۔ [المعاملات المالية المعاصرة للدكتور محمد عثمان شبیر: ص ۳۳۹]

ظاہر ہے جب ذخیرہ حدیث وفقہ میں اس اصطلاح کا ذکر ہی نہیں تو ہمیں اسکی حقیقت جاننے کے لیے اسلامی بینکنگ کے ماہرین کی طرف ہی رجوع کرنا پڑے گا۔ چنانچہ المعاییر الشرعیۃ میں اسکی تعریف یوں بیان ہوئی ہے۔

((المشاركة المتناقصة عبارة من شركة يتعهد فيها احد الشركاء

بشراء حصة الآخر تدريجاً الى ان يملك المشتري المشروع

بكاملاً)) [ایضاً۔ ص ۲۰۶]

”مشار کہ متاقصہ ایسی شرکت سے عبارت ہے جس میں ایک شریک یہ عہد کرتا ہے کہ وہ آہستہ آہستہ دوسرے شریک کا حصہ خرید لے گا یہاں تک کہ مشتری پورے منصوبے کا مالک ہو جائے۔“

اسکی عملی تطبیق کیا ہوتی ہے؟ یہ سمجھنے کے لیے ہم جناب مولانا تقی عثمانی صاحب کی کتاب ”اسلامی بینکاری کی بنیادیں“ سے ایک اقتباس نقل کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

”مشار کہ کی ایک اور شکل جسے ماضی قریب میں ترقی دی گئی ہے ”مشار کہ متاقصہ“ ہے۔ اس تصور کے مطابق ایک تمویل کار اور اس کا عمیل کسی جائیداد، سامان یا کاروباری ادارے کی مشترکہ ملکیت حاصل کرتے ہیں۔ تمویل کار کا حصہ کئی یونٹس میں تقسیم کر لیا جاتا ہے اور یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ عمیل تمویل کار کے حصے کے کئی یونٹس ایک ایک کر کے کچھ وقفوں کے بعد خرید لے گا جسکے نتیجے میں اس کا حصہ کم ہوتا رہے گا۔ یہاں تک کہ اس کے تمام یونٹس عمیل خرید لے گا اور جائیداد یا کاروباری ادارے کا تنہا مالک بن جائے گا۔“

شرکت متاقصہ کے اس تصور کو مختلف معاملوں میں مختلف طریقوں سے اختیار کیا جاتا ہے۔ چند نمونے ذیل میں دیے جاتے ہیں۔

اسے عام طور پر ہاؤس فنانسنگ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ عمیل ایک گھر خریدنا چاہتا ہے جس کے لیے اس کے پاس کافی رقم موجود نہیں ہے۔ یہ ایک تمویل کار کے پاس جاتا ہے جو اس کے ساتھ مل کر ایک گھر خریدنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ قیمت کا بیس فیصد عمیل ادا کرتا ہے اور اسی فیصد تمویل کار، لہذا گھر کے اسی فیصد حصے کا مالک تمویل کار ہے اور بیس فیصد کا عمیل، جائیداد کو مشترکہ خریدنے کے بعد عمیل گھر کو اپنی رہائشی ضرورتوں کے لیے استعمال کرتا ہے اور تمویل کار کو جائیداد میں اس کا حصہ استعمال کرنے کی وجہ سے کرایہ ادا کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تمویل کار کے حصے کو آٹھ برابر یونٹس میں تقسیم کر لیا جاتا ہے۔ ہر یونٹ گھر کے دس فیصد ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے۔ (کیونکہ اس کی کل ملکیت اسی فیصد تھی) عمیل، تمویل کار سے یہ وعدہ

کرتا ہے کہ ہر تین ماہ بعد ایک یونٹ خریدے گا۔ چنانچہ تین ماہ کی پہلی مدت پوری ہونے پر وہ گھر کی قیمت کا دس فیصد حصہ ادا کر کے ایک یونٹ خرید لیتا ہے۔ اس سے تمویل کار کا ایک حصہ اسی فیصد سے کم ہو کر سترہ فیصد ہو جائے گا۔ تمویل کار کا ادا کیا جانے والا کرایہ بھی اس قدر کم ہو جائے گا۔ دوسری مدت کے پورا ہونے کے بعد ایک اور یونٹ خریدے گا جس سے جائیداد میں اس کا حصہ بڑھ کر چالیس فیصد ہو جائیگا اور تمویل کار کا کم ہو کر ساٹھ فیصد رہ جائے گا اور اسی تناسب سے کرایہ بھی کم ہو جائے گا۔ یہ ترتیب اسی طریقے سے چلتی رہے گی یہاں تک کہ دو سال کے اختتام پر عمیل تمویل کار کا سارا حصہ خرید لے گا جس سے اس کا حصہ ”صفر“ رہ جائے گا۔ اور عمیل کا حصہ سو فیصد ہو جائیگا۔

یہ طریقہ کار تمویل کار کو یہ اجازت دیتا ہے کہ جائیداد میں اپنی ملکیت کے تناسب سے کرایہ کا دعویٰ کرے اور اسی کے ساتھ اپنے حصے کے یونٹس کی بیع کے ذریعے سے اپنا اصل سرمایہ وقفہ وقفہ سے واپس حاصل کرے۔“ [ایضاً: ص: ۸۵، ۸۶، ۸۷]

یہ اقتباس ہے تو طویل مگر اس سے مشارکہ متناقصہ کی عملی صورت پوری طرح نکھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ اس اقتباس میں کوئی ایسی بات نہیں جو قابل تشریح ہو۔ یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ بینک اپنے حصے کا کرایہ مارکیٹ ریٹ کی بجائے شرح سود کے مطابق وصول کرتا ہے۔

مشارکہ متناقصہ شرکت کی کس قسم میں داخل ہے:

”المعايير الشرعية“ کے مطابق شرکت کی یہ جدید قسم شرکت العنان کی ذیلی شاخ ہے۔ لہذا اس پر وہ تمام احکام نافذ ہوں گے جو عام شرکت پر ہوتے ہیں۔ خصوصاً شرکت العنان کے۔ علامہ وہبہ زحلی رحمہ اللہ نے بھی اس کو شرکت العنان ہی قرار دیا ہے۔ [المعاملات المالية المعاصرة: ص ۴۳۶]

”شرکة العنان“ کیا ہے؟

شرکت کی بنیادی قسمیں دو ہیں:

۱۔ شرکۃ الاملاک۔

۲۔ شرکۃ العقود۔

شرکہ املاک کسی چیز کے استحقاق میں شراکت کا نام ہے جیسے کسی اثاثے، کارخانے یا گاڑی وغیرہ کی ملکیت میں اشتراک۔ جبکہ تصرف میں اشتراک کو شرکہ العقود کہا جاتا ہے۔ جیسے خرید و فروخت میں اشتراک، یہ اشتراک یا تو مال و عمل دونوں میں ہوگا یا صرف عمل میں۔ اسکی پانچ قسمیں ہیں۔

”اگر مال و عمل دونوں میں شراکت ہو تو اس کو شرکہ العنان کہا جاتا ہے۔“

[الملخص الفقہی: ۲: ص ۶۸]

چونکہ ہمارے زیر بحث یہی قسم ہے اس لیے ہم صرف اسی کے متعلق گفتگو کریں گے۔ علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ نے اسکی حقیقت ان الفاظ میں بیان کی ہے:

((ان يشترك رجلان بماليهما على ان يعملما فيهما بابدانهما

و الربح بينهما)) [المغنی: ۷: ص ۱۲۳]

”دو شخص اپنے اپنے مال کے ساتھ اس شرط پر اشتراک کریں کہ دونوں جسمانی محنت کریں گے اور نفع ان دونوں میں تقسیم ہوگا۔

شیخ صالح بن فوزان رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((فحقيقة شركة العنان ان يشترك شخصان فاکثر بماليهما

بحيث يصيران مالا واحدا يعملان فيه بيديهما او يعمل فيه

احدهما ويكون له الربح اكثر من نصيب الآخر)) [الملخص

الفقہی: ۲: ص ۷۱]

”شرکہ العنان“ کی حقیقت یہ ہے کہ دو یا دو سے زیادہ افراد اپنے مالوں کے ساتھ

شراکت داری کریں اس طرح کہ دونوں کا مال ایک ہی بن جائے۔ دونوں اس میں

جسمانی محنت کریں یا ان میں سے صرف ایک کرے (دوسری صورت میں) کام

کرنے والے کے نفع کا حصہ دوسرے سے زیادہ ہوگا۔“

”المعايير الشرعية“ میں ہے:

”شرکہ عمان اس چیز کا نام ہے کہ دو یا دو سے زیادہ متعین مال کے ساتھ شراکت داری کریں اس طرح دونوں میں سے ہر ایک کو شراکت کے مال میں تصرف کا حق ہو اور نفع ان دونوں کے درمیان طے شدہ اصول کے مطابق تقسیم ہوگا اور خسارہ اپنے اپنے حصے کے مطابق برداشت کریں گے۔“ [ص ۱۹۵]

ان عبارتوں سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہوتی ہے کہ شرکہ العنان میں فریقین کا مقصد چیز کو فروخت کر کے نفع کمانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شرکہ العنان کی شرطوں میں ایک شرط یہ ہے کہ نفع میں فریقین میں سے ہر ایک کا حصہ طے ہو۔ ملاحظہ ہو: [نبیل المآرب بشرح دلیل الطالب: ص ۱۹۳، الملخص الفقہی: ۲ ص ۷۰۔]

لیکن جب ہم بینکوں میں رائج مشارکہ متناقصہ کو دیکھتے ہیں تو اس میں یہ چیز نظر نہیں آتی یہاں نہ تو نفع کا تناسب طے ہوتا ہے اور نہ ہی کلائنٹ کا مقصد اس کو فروخت کر کے نفع کمانا بلکہ وہ تو اپنی رہائش کے لیے یہ معاملہ کرتا ہے۔ لہذا ثابت ہوا کہ مشارکہ متناقصہ شرکہ عمان میں داخل نہیں ہے۔

مشارکہ متناقصہ میں بینک اپنے حصے کے یونٹ کس قیمت پر بیچے گا:

یہاں چار صورتیں ہی ممکن ہیں:

۱۔ بینک نے جتنی رقم لگائی ہے اس سے زیادہ کے بدلے بیچے۔

۲۔ اتنے ہی کا بیچے۔

۳۔ اس سے کم پر بیچے۔

۴۔ بازاری قیمت کے مطابق فروخت کرے۔

تیسری صورت ممکن نہیں کیونکہ اس میں بینک راضی نہیں ہوگا۔ باقی تین صورتیں شرعاً جائز نہیں۔ پہلی صورت اس لیے کہ اس میں گویا بینک نے ضمانت لی ہے کہ اس کا راس المال مع نفع اسے لوٹا جائیگا۔ یہ شراکت کے اصولوں کے خلاف ہے۔ شرکت کی تو بنیاد ہی

اس پر ہے کہ نفع اور نقصان میں دونوں شریک ہوں گے گویا یہ حصول سود کا ایک حیلہ ہے۔
دوسری صورت (یعنی اتنے ہی کا بیچے) کو خود اسلامی بینکنگ کے ماہرین ناجائز قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ المعاییر الشرعیۃ میں ہے:

((ولا يجوز اشتراط البيع بالقيمة الاسمية)) [ص ۲۰۷]

”قیمت اسمیہ (Face Value) پر بیع کی شرط لگانا جائز نہیں۔“

دوسری جگہ ہے:

((ولا يجوز الوعد بالشراء بالقيمة الاسمية)) [ص ۱۹۹]

”قیمت اسمیہ (Face Value) پر خریدنے کا وعدہ کرنا ناجائز ہے۔“

اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ گویا بینک نے یہ گارنٹی حاصل کر لی ہے اس کا راس المال بہر صورت واپس کیا جائے گا۔ یہ شرکت کے اصول کے منافی ہے۔

آخری صورت اس لیے جائز نہیں کہ اس میں غرر پایا جاتا ہے کیونکہ کلائنٹ کی طرف سے خریدنے کا وعدہ لازمی ہوتا ہے جس سے وہ منحرف نہیں ہو سکتا۔ اس کے متعلق ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ بیع میں لازمی وعدہ بیع ہی کی ایک شکل ہے۔ جب بیع اس شرط پر ہو کہ مستقبل میں جو بازاری قیمت ہوگی اس پر میں خرید لوں گا تو اس میں غرر واضح ہے۔

بینک اپنا حصہ کس قیمت پر فروخت کرتا ہے:

اس تحقیق کی غرض سے جب ہم نے اسلامی بینکاری کے ریسرچ سکا لرجناب محمد ایوب جو اسٹیٹ بینک شعبہ اسلامی بینکاری کے اسٹنٹ رہے ہیں اور انہوں نے اس موضوع پر انگریزی میں ایک کتاب بھی لکھی ہے جو لندن سے شائع ہو چکی ہے، سے پوچھا تو ان کے بقول بینک اپنے یونٹس قیمت اسمیہ پر فروخت کرتا ہے۔ کیونکہ بینک کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے لگائے ہوئے سرمایہ کو مختلف یونٹس میں تقسیم کر لیتا ہے۔ مثلاً اگر بینک نے دس لاکھ روپیہ لگایا ہے تو وہ اس کو پچاس پچاس ہزار کے بیس یونٹس میں تقسیم کرے گا۔ جو کلائنٹ نے وقفے سے اتنی ہی قیمت میں خریدنے ہوتے ہیں۔ ہمارے اس سوال پر کہ یہ تو شریعہ

سٹینڈرز کے مطابق جائز نہیں، انہوں نے کہا کہ شریعہ سٹینڈرز مشارکہ متناقصہ کو شرکہ العنان جو کہ شرکہ عقد کی قسم ہے کے تناظر میں دیکھتا ہے جبکہ اسلامی بینک اس کو شرکہ ملک میں شمار کرتے ہیں۔ شرکہ عقد میں تو قیمت اسمیہ پر فروخت کرنے کا معاہدہ نہیں ہو سکتا البتہ شرکہ ملک میں جائز ہے۔ لیکن یہ رائے دو وجہ سے درست نہیں۔

۱۔ بقول ڈاکٹر رفیق یونس مشارکہ متناقصہ میں بینک کی غرض شراکت داری نہیں ہوتی نہ ہی اس کے پیش نظر بیع اور اجارہ ہوتا ہے بلکہ اصل مقصد تمویل ہے۔ اس میں بیع اور اجارہ کو گھسیٹنے کا مقصد تو صرف تمویل کے ذریعے فائدہ حاصل کرنا ہے۔ جیسا کہ ہم پیچھے ان کے حوالے سے بیان کر آئے ہیں۔

۲۔ شرکہ ملک میں کوئی فریق دوسرے کو اس پر مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ ضرور اس کا حصہ خریدے جبکہ یہاں شروع ہی میں یہ معاہدہ ہو جاتا ہے کہ کلائنٹ بینک کا حصہ خریدنے کا پابند ہوگا۔ ڈاکٹر رفیق یونس مصری بینکوں میں رائج مشارکہ متناقصہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

((ولا شك ان المشروعية تكون حيث يكون الوعد غير ملزم والتناقض بالقيمة السوقية، والتنازل عن الملكية تدريجيا مع كل قسط.....وقل من يفعل ذلك كله من المصارف الاسلامية، سبب ذلك ان هذه العملية ظاهرها المشاركة وحقيقتها التمويل المصرفي)) [المصارف الاسلامية: ص ۴۲]

”اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ تب جائز ہو سکتا ہے جب وعدہ لازمی نہ ہو اور بازاری قیمت پر فروخت ہو اور بینک اپنی ملکیت سے ہر قسط سے تدریجاً دست کش ہو۔ شاذ و نادر ہی کوئی اسلامی بینک ایسا ہوگا جو یہ تمام شرطیں پوری کرتا ہو۔ اس کا سبب یہ ہے بظاہر یہ کاروائی مشارکہ اور حقیقت میں بینکنگ فنانسنگ ہے۔

تورق:

مرجہ اسلامی بینکوں میں تمویل کا چوتھا ذریعہ تورق ہے۔ اس کا مطلب ایسی بیع ہے

جس کا مقصد چیز کو ذاتی استعمال میں لانا یا نفع کمانا نہیں بلکہ محض نقدی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کو نقدی کی ضرورت ہے تو وہ کوئی چیز ادھار زیادہ قیمت پر خرید کر نقد کم پر فروخت کر دے۔ اس میں یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ چیز کسی تیسرے شخص کو فروخت کرے نہ کہ اسی کو جس سے خریدی ہے۔ چنانچہ الموسوعة الفقهية الكويتية میں بیع تورق کا اصطلاحی معنی یوں لکھا ہے:

((والتورق في الاصطلاح ان يشتري سلعة نسيئة ثم يبيعها نقدا بغير البائع باقل مما اشتراها به ليحصل بذلك على النقد))
 ”اصطلاح میں تورق کا معنی ہے کہ آدمی کوئی چیز ادھار خریدے پھر بیچنے والے کے علاوہ کسی دوسرے کے پاس قیمت خرید سے کم قیمت پر فروخت کر دے تاکہ اس طریقہ سے نقد رقم حاصل کر سکے۔“
 شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

((ولو كان مقصود المشتري الدرهم وابتاع السلعة الى اجل لبيعها وياخذ ثمنها فهذا يسمى التورق)) [مجموعه فتاوى: ۲۹، ص ۳۰]

”اگر خریدار کا مقصد درہم ہو اور وہ ادھار سودا خریدے تاکہ اسے بیچ کر پیسے حاصل کر سکے تو اسے تورق کہتے ہیں۔“

دوسری جگہ بیع عینہ اور تورق میں فرق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

((واما الذي لم يعد الى البائع بحال بل باعها المشتري من مكان اخر لجاره فهذا يسمى التورق)) [مجموعه فتاوى: ۲۹، ص ۴۳]

”جب چیز کسی بھی حالت میں بائع کی طرف نہ لوٹے بلکہ مشتری اس کو دوسری جگہ فروخت کر دے تو اسکو تورق کہا جاتا ہے۔“

تورق اور بیع عینہ میں فرق:

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

((فهذا المضطر ان اعاد السلعة الى بائعها فهي العينة وان باعها

لغيره فهو التورق)) [اعلام الموقعين: ج ۳ ص ۹۴۹]

”مجبور شخص اگر چیز کو بیچنے والے کے پاس فروخت کرے تو اسکو عینہ کہتے ہیں اگر وہی چیز کسی دوسرے کے پاس فروخت کرے تو اس کو تورق کہتے ہیں۔“
دوسری جگہ لکھتے ہیں:

((فأحمد رحمه الله تعالى أشار إلى أنَّ العينة إنَّما تقع من رجل مضطرٍّ إلى نقدٍ لأنَّ المؤسِّر يضمن عليه بالقرض فيضطرُّ إلى أن يشتري منه سلعة ثمَّ يبيعها فإنَّ اشتراها منه بائعها كانت عينة وإنَّ باعها من غيره فهي التورق)) [تهذيب السنن: ج ۵، ص ۱۰۸]

”امام احمد رحمہ اللہ نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ بیع عینہ کا معاملہ اس شخص سے ہوتا ہے جو نقدی کا محتاج ہوتا ہے کیونکہ خوشحال شخص اسکو قرض دینے میں بخل سے کام لیتا ہے تو وہ اس پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس سے کوئی چیز خرید کر پھر اس کو بیچ دے۔ اگر اس چیز کو وہ بیچنے والا ہی خریدے تو یہ بیع عینہ ہوتی ہے اور اگر وہ کسی دوسرے کے پاس بیچے تو اس کو تورق کہتے ہیں۔“

قطر کے معروف عالم ڈاکٹر علی احمد سالوس رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

((والتورق بهذا المعنى هو العينة عند الائمة الاربعة ومن جاء بعدهم بيضعة قرون ولعل شيخ الاسلام ابن تيمية هو اول من ذكر هذا التورق ثم جاء احوال الحنابلة من بعده)) [موسوعة القضايا الفقيهية المعاصرة: ص ۸۹۸]

”آئمہ اربعہ اور ان کے بعد کئی صدیوں تک جو آئے ان کے نزدیک اس معنی میں تورق بیع عینہ ہی ہے۔ شاید شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس تورق کا ذکر کیا پھر ان کے بعد فقہاء حنابلہ کے اقوال میں اس کا تذکرہ آیا ہے۔“

”الموسوعة الفقهية“ کے مطابق اس اصطلاح کا ذکر صرف فقہاء حنابلہ کے ہاں ملتا ہے دوسرے فقہاء اسکو بیع عینہ کے تحت زیر بحث لاتے ہیں۔

((بذكر الفقهاء التورق فبی بحث بیع العينة والبیوع المنهی عنها والربا))

”فقہاء بیع تورق کو بیع عینہ ممنوعہ بیوع اور سود کی بحث میں ذکر کرتے ہیں۔“

تورق کا شرعی حکم:

اس کے شرعی حکم میں تین آراء ہیں:

- ۱۔ سعودی عرب کے سابق مفتی اعظم شیخ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ کی رائے میں یہ جائز ہے۔ [فتاویٰ اسلامیہ: ج ۲- ص ۴۴۳] بعض دوسرے علماء کی بھی یہی رائے ہے۔
 - ۲۔ شیخ شمیم رحمہ اللہ کی رائے میں اگر انسان کو رقم کی ضرورت ہو اور یہ جائز طریقہ سے ممکن نہ ہو اور عقد میں سود کی مشابہت نہ پائی جائے اور آدمی چیز کو قبضے کے بعد ہی فروخت کرے تو اس کی اجازت ہے ورنہ نہیں۔ [رسائل فقیہہ: ص ۱۰۷]
 - ۳۔ یہ کسی بھی صورت جائز نہیں۔
- شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز اور ایک روایت کے مطابق امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اسکو مکروہ کہا ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز فرماتے ہیں:

((التورق اخیة الربا ای اصل الربا وهذا القول اقوی))

[مجموعہ فتاویٰ: ۲۹ ص ۴۳۱]

”تورق ربا کی جڑ ہے یعنی ربا میں ملوث کرنے کا باعث ہے یہ قول زیادہ قوی ہے۔“

عظیم محدث امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وكان شيخنا رحمه الله يمنع من مسألة التورق وروجع فيها مرازا وانا حاضر فلم يرخص فيها وقال المعنى الذى لاجله حرم الربا

موجود فيها بعينة من زيادة الكلفة بشراء السلعة وبيعها والخسارة فيها فالشريعة لاتحرم الضرر الادنى وتبيح ما هو اعلى منه))

[اعلام الموقعين: ج ۳ ص ۹۵۰]

”ہمارے استاد (امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ) تورق سے منع کرتے تھے۔ ان سے میری موجودگی میں متعدد مرتبہ پوچھا گیا مگر انہوں نے اس کی اجازت نہ دی وہ فرماتے تھے جس وجہ سے سود کو حرام قرار دیا گیا ہے وہ اس (تورق) میں بعینہ موجود ہے۔ اس کے ساتھ چیز خریدنے اور بیچنے کی تکلیف الگ ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ شریعت کم تر ضرر کو تو حرام قرار دے مگر بڑے ضرر کو جائز قرار دے۔“

الموسوعة الفقية الكويتية میں لکھا ہے کہ جمہور علماء اس کو جائز سمجھتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر علی احمد سالوس رحمہ اللہ موسوعہ کے اس دعویٰ سے متفق نہیں ہیں۔ چنانچہ انہوں نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ جمہور فقہاء بھی اس کو غلط ہی قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ بیع عینہ ہی میں شامل ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے انکی کتاب ”موسوعة القضايا الفقهية المعاصرة“

رائج رائے:

اگر قائلین اور مانعین کے دلائل کا موازنہ کیا جائے تو ان حضرات کی رائے زیادہ قوی معلوم ہوتی ہے جو اس کے حق میں نہیں ہیں۔ نتیجے کے اعتبار سے تورق اور سود میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کیونکہ جب تورق میں اصل غرض نقدی حاصل کرنا ہے نہ کہ کسی بھی لحاظ سے چیز سے فائدہ اٹھانا تو ادھار کی صورت میں زیادہ قیمت لینے کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ اسی لیے تو امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ جس وجہ سے سود حرام ہے وہ اس میں بعینہ موجود ہے۔ بلکہ خرید و فروخت کی تکلیف اضافی ہے۔

بینکوں میں تورق کا استعمال:

ہماری معلومات کے مطابق پاکستان میں ابھی تک اسلامی بینکوں نے اس پر عمل شروع

نہیں کیا۔ البتہ ملائیشیا اور بعض عرب ممالک میں کچھ سالوں سے اس کا استعمال جاری ہے۔ زیادہ تر یہ معاملہ عالمی مارکیٹ میں میٹل جیسے زنک، برنز، نکل اور تانبے وغیرہ کے سودوں میں کیا جاتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک ایسا گاہک جس کو نقدی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسلامی بینک سے یہ کہتا ہے کہ وہ اس نوع کا میٹل جو عام طور پر دوسرے ملک میں ہوتا ہے، ادھار قسطوں پر خریدنے کے لیے تیار ہے۔ یہ سودا میٹل کے یونٹ کے حساب سے ہوتا ہے۔ جس کا وزن اور قیمت طے ہوتی ہے اور یہ بھی پہلے ہی طے ہوتا ہے کہ سودا مکمل ہونے کے بعد بینک گاہک کے وکیل کی حیثیت سے اس کو آگے فروخت کر کے رقم اس کے کھاتے میں جمع کر دے گا۔ جو وہ نکلوا کر اپنی ضرورت پوری کر سکے گا۔ ظاہر ہے کہ بینک نے ادھار کی صورت میں زیادہ قیمت لگانی ہے اور آگے کم قیمت پر فروخت کرنا ہے۔ دونوں دوسودوں کے درمیان جو فرق ہو گا وہ بینک کا نفع ہو گا۔ مثلاً بینک نے ایک لاکھ ڈالر کا ایک سودا ادھار قسطوں پر بیچا ہے تو وہ اس کے وکیل کی حیثیت سے آگے اس کو پچانوے ہزار ڈالر میں فروخت کر کے رقم اس کے کھاتے میں جمع کروادے گا۔ جس سے وہ اپنی مالی ضرورت پوری کر لے گا۔ بینک ایک لاکھ ڈالر قسطوں میں وصول کرے گا۔ اس طرح بینک کو پانچ ہزار ڈالر کا فائدہ ہو جائے گا۔ تورق کی یہ قسم کئی لحاظ سے سطور بالا میں بیان ہونے والی قسم سے مختلف ہے۔

✽ اس میں فروخت کنندہ یعنی بینک خریدار اور فروخت کنندہ کے درمیان واسطہ ہوتا ہے۔ جبکہ پہلی قسم میں فروخت کنندہ کا درمیان میں کوئی کردار نہیں ہوتا۔

✽ تورق کی اس نوع میں نقدی کا ضرور تمند خود بینک سے جس کا اب وہ مدیون (مقرض) ہو چکا ہے رقم وصول پاتا ہے۔ جبکہ تورق کی اول الذکر قسم میں وہ آخری خریدار سے خود وصول پاتا ہے۔ اس میں پہلے فروخت کنندہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

✽ اسلامی بینکوں میں رائج تورق ادھار اور نقد دو بیعوں کو مجموعہ ہوتی ہے۔ جو حقیقت میں ایک دوسرے کے ساتھ مشروط ہوتی ہے۔ فقہی تورق میں یہ چیز نہیں ہوتی۔

❁ فقہی تورق میں وہ چیز زیادہ یا قیمت خرید پر بکنے کا احتمال بھی ہوتا ہے لیکن بینکوں میں رائج تورق میں اس کا کم قیمت پر بیچنا طے ہوتا ہے۔

شرعی حیثیت:

❁ جب رائج رائے مطابق تورق بذات خود منع ہے تو یہ صورت بدرجہ اتم ممنوع ہونی چاہیے کیونکہ یہ کئی لحاظ ہے اس سے مختلف ہے اور پھر سب کام بینک کے کرنے کی وجہ سے اس کی مشابہت سود اور بیع عینہ سے ہو جاتی ہے۔

❁ نبی ﷺ کا فرمان ہے ایک بیع میں دو شرطیں درست نہیں۔ اس میں تو کئی شرطیں پائی جاتی ہیں مثلاً:

* یہ شرط کہ مشتری بینک کو وکیل بنائے گا۔

* مشتری وکالت منسوخ نہیں کر سکتا۔

* بینک کی قیمت خرید سے زیادہ پیسے دے گا۔

* آگے کم قیمت پر فروخت کرے گا۔

❁ جس چیز پر سود ہوتا ہے وہ بینک کے پاس پہلے سے موجود نہیں ہوتی بلکہ بینک بعد میں خریدتا ہے۔ اس طرح یہ ”مرا بحة للآمر بالشراء“ ہے جو بذات خود جائز نہیں۔

بَيْعٌ سَلَمٌ:

بعض اسلامی بینکوں میں تمویلی سرگرمیوں کے لئے بیع سلم کا استعمال بھی جاری ہے سلم ایک معروف شرعی اصطلاح ہے جس سے مراد لین دین اور خرید و فروخت کی وہ قسم ہے جس میں ایک شخص یہ ذمہ داری قبول کرتا ہے کہ وہ مستقبل کی فلاں تاریخ پر خریدار کو ان صفات کی حامل فلاں چیز مہیا کرے گا۔ شیخ الاسلام حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَالسَّلَامُ شَرْعًا بَيْعٌ مَوْصُوفٌ فِي الذَّمَّةِ)) [فتح الباری: ج ۴ ص ۵۴۰]

”سلم کا شرعی معنی ہے ایسی چیز بیچنے کی ذمہ داری اٹھانا جس کی صفات بیان کر دی گئی ہوں“

اس کو سلف بھی کہتے ہیں کیونکہ اس میں بیچی گئی چیز کی قیمت معاہدے کے وقت ہی ادا کر دی جاتی ہے۔ یعنی یہ بیع کی وہ قسم ہے جس میں قیمت تو فوری ادا کر دی جاتی ہے مگر چیز بعد میں فراہم کی جاتی ہے۔

نبی ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہاں بیع کی یہ صورت بھی رائج تھی آپ ﷺ نے اس سے کلیۃً منع کرنے کی بجائے بنیادی اصلاحات کر کے اس کو باقی رکھا جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

((قَدِمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَدِينَةَ، وَهُمْ يُسَلِّفُونَ بِالتَّمْرِ السَّنَتَيْنِ وَالثَّلَاثَ، فَقَالَ مَنْ أَسْلَفَ فِي شَيْءٍ فَنِي كَيْلٍ مَعْلُومٍ وَوَزْنٍ مَعْلُومٍ،

إِلَى أَجَلٍ مَعْلُومٍ)) [صحیح بخاری: باب المسلم فی وزن معلوم]

”نبی ﷺ مدینہ تشریف لائے تو لوگ کھجوروں میں دو اور تین سال کے لیے بیع سلم کرتے تھے اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص بیع سلم کرنا چاہتا ہے وہ متعین پیمانے اور وزن میں متعین مدت کے لیے کرے۔“

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

((أَشْهَدُ أَنَّ السَّلَفَ الْمَضْمُونُ إِلَى أَجَلٍ مُّسَمًّى قَدْ أَحَلَّهُ اللَّهُ فِي كِتَابِهِ

وَأَذِنَ فِيهِ ثُمَّ قَرَأَ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدِينٍ إِلَى أَجَلٍ

مُسَمًّى فَاتَّكِبُوهُ﴾)) [مصنف ابن ابی شیبہ: ج ۵ ص ۲۷۷، مستدرک

حاکم: ج ۷ ص ۲۵۸]

”میں گواہی دیتا ہوں کہ مقررہ مدت تک ضمانت دی گئی سلم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جائز قرار دیا ہے اور اس کی اجازت دی ہے۔ پھر انہوں نے قرآن حکیم کی یہ آیت تلاوت فرمائی۔“

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدِينٍ إِلَى أَجَلٍ مُّسَمًّى

فَاتَّكِبُوهُ﴾ [البقرہ: ۲۸۲]

”اے ایمان والو! جب تم آپس میں مقررہ وقت تک ادھار کا معاملہ کرو تو اس کو لکھ لیا کرو۔“

حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

((إِنَّا كُنَّا نُسَلِّفُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ فِي الْحِنْطَةِ، وَالشَّعِيرِ وَالزَّيْبِ، وَالتَّمْرِ)) [صحیح بخاری: باب السلم فی وزن معلوم]

”ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے دور میں گندم، جو، کھجور اور مرقہ میں بیع سلم کرتے تھے۔“

شیخ الاسلام حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

((وَاتَّفَقَ الْعُلَمَاءُ عَلَى مَشْرُوعِيَّتِهِ إِلَّا مَا حُكِيَ عَنْ ابْنِ الْمُسَيَّبِ))

[فتح الباری: ج ۴ ص ۵۴۰]

”سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ تمام علماء اس کے جواز پر متفق ہیں۔“

سلم کی اجازت کا فلسفہ:

بعض کسانوں اور مینوفیکچرز کے پاس ضرورت کے مطابق مثلاً بج، کھادوں، آلات، خام مال خریدنے اور لیبر کے لیے رقم نہیں ہوتی۔ ایسے لوگوں کو اسلام نے یہ سہولت دی ہے کہ وہ حصول رقم کی خاطر اپنی فصل یا پیداوار قبل از وقت فروخت کر سکتے ہیں تاکہ قرض کے لیے کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے بچے رہیں۔ اضافی فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی چیز بیچنے کے لیے کسٹمر تلاش کرنے کی فکر سے آزاد ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس کا سودا پہلے ہی ہو چکا ہوتا ہے۔ اس سے خریدار کو بھی فائدہ پہنچتا ہے کیونکہ سلم میں قیمت ان چیزوں کی نقد قیمت سے کم ہوتی ہے جو نقد ادا کی جانی ہو۔ مزید برآں اگر چیز آگے بچنا چاہتا ہو تو مارکیٹنگ کے لیے مناسب وقت مل جاتا ہے۔

کیا سلم خلاف قیاس ہے؟

شرعی اصول کے مطابق انسان کو وہی چیز بیچنے کی اجازت ہے جو نہ صرف وجود میں

آچکی ہو بلکہ اس کی ملکیت اور قبضہ میں ہو جبکہ سلم میں عقد کے وقت چیز کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ اس بنا پر بعض فقہاء نے کہا ہے کہ سلم بیع معدوم کی ایک استثنائی صورت ہے۔ مگر امام ابن قیم رحمہ اللہ اس سے متفق نہیں ہیں چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

((وأما السلم فمن ظن أنه على خلاف القياس توهم دخوله تحت قول النبي صلى الله عليه وسلم لا تبع ما ليس عندك فإنه بيع معلوم والقياس يمنع منه والصواب أنه على وفق القياس فإنه بيع مضمون في النعمة موصوف مقلود على تسليمه غالبا وهو كالمعارضة على المنافع في الإجارة وقد تقدم أنه على وفق القياس)) [اعلام الموقعين ج ۲ ص ۱۹]

”اس کا مطلب ہے کہ جو حضرات سلم کو خلاف قیاس سمجھتے ہیں وہ اس کو نبی ﷺ کے اس ارشاد ”جو چیز تیرے پاس موجود نہیں اس کو فروخت نہ کر۔“ میں داخل سمجھنے کی غلطی کرتے ہیں جبکہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ قیاس کے مطابق ہے۔ کیونکہ یہ ایسی بیع ہے جس میں انسان ایسی چیز جس کو عام طور پر حوالے کر سکتا ہوتا ہے بیان کی گئی صفات کے مطابق بیچنے کی ذمہ داری اٹھاتا ہے۔ یہ اجارہ میں منفعت کا معاوضہ لینے جیسی صورت ہے۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے کہ یہ قیاس کے مطابق ہے۔“

سلم کی شرطیں:

اس میں ان تمام پابندیوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے جو شریعت نے عام بیع کیلئے مقرر کی ہیں تاہم معاملہ کو غرر سے پاک رکھنے کے لئے کچھ خاص شرطیں بھی رکھی گئی ہیں۔ مثلاً:

✽ جس چیز کا سودا کیا جا رہا ہو معاہدے کے وقت اس کی نوعیت، اوصاف، مقدار، تعداد اور مالیت کا تعین پہلے سے کیا جاسکتا ہو۔ جن چیزوں میں یہ ممکن نہ ہو ان میں بیع سلم جائز نہیں ہوتی۔ جیسے قیمتی موتی، جواہرات اور نوادرات ہیں کیونکہ ان کی اکائیاں ایک دوسرے سے کافی مختلف ہوتی ہیں۔

✽ جو چیز بیچی اور جو قیمت میں دی جا رہی ہو دونوں کا تعلق ان اموال سے نہ ہو جن میں

فوری قبضہ کی شرط ضروری ہے جیسے چاندی کے عوض سونے کی بیع یا گندم کے بدلے گندم کا سودا۔ کیونکہ اس قسم کے تبادلہ میں موقع پر قبضہ شرط ہے۔

✽ مکمل قیمت معاہدہ کے وقت ہی ادا کر دی جائے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے۔
 ((مَنْ سَلَفَ فِي تَمْرِ فَلَيْسَ لِفِي كَيْلٍ مَعْلُومٍ، وَوَزْنٍ مَعْلُومٍ))

[صحیح بخاری: کتاب السلم، باب السلم فی کیل معلوم]

”جو کچھوروں میں بیع سلف کرے وہ معلوم پیمانے اور معلوم وزن میں کرے۔“
 سلف سلم کا دوسرا نام ہے اور اس کو سلف اس لے کہا جاتا کہ اس میں قیمت پیشگی ادا کر دی جاتی ہے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں یعنی پیشگی قیمت کی شرط آپ ﷺ نے خود لگائی ہے۔ اور اگر پوری قیمت پہلے ادا نہ کی جائے تو یہ ادھار کا ادھار کے ساتھ تبادلہ ہوگا جو شرعاً ممنوع ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَأَتَّفَقُوا عَلَى أَنَّهُ يَشْتَرِطُ لَهُ مَا يَشْتَرِطُ لِلْبَيْعِ، وَعَلَى تَسْلِيمِ رَأْسِ

الْمَالِ فِي الْمَجْلِسِ)) [فتح الباری: ۴ ص ۵۴۰]

”علماء اس پر متفق ہیں کہ اس کی بھی وہی شرطیں ہیں جو عام بیع کی ہیں اور اس پر بھی متفق ہیں کہ مجلس میں اس المال حوالے کرنا ضروری ہے۔“
 امام شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

((هذا الشرط لا بد منه ولا يتم السلم إلا به وإلا كان من بيع

الكالء بالكالء وقد قدمنا النهى عنه)) [السييل الحرار: کتاب

البيع باب السلم]

”یہ شرط ضروری ہے اس کے بغیر سلم مکمل نہیں ہوتا ورنہ یہ ادھار کی ادھار کے ساتھ بیع ہوگی۔ اور اس کی ممانعت ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔“

✽ مدت حوالگی پوری طرح واضح ہو۔ اگر اس میں کسی قسم کا ابہام پایا جائے تو بیع سلم درست نہ ہوگی۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نقل کرتے ہیں:

((أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى عَنْ بَيْعِ حَبْلِ الْحَبْلَةِ، وَكَانَ يَبْعُ أَتْبَاعَهُ أَهْلَ الْجَاهِلِيَّةِ، كَانَ الرَّجُلُ يَتَّاعُ الْحَزُورَ إِلَى أَنْ تُنْتَجِ النَّاقَةُ، ثُمَّ تُنْتَجِ النَّبِيُّ فِي بَطْنِهَا)) [صحيح بخاری: باب بیع الغرر وحبل الحبله]

”بلاشبہ رسول اللہ ﷺ نے حاملہ کے حمل کی بیع سے منع فرمایا ہے۔ (نافع کہتے ہیں) بیع کی یہ صورت زمانہ جاہلیت میں رائج تھی۔ آدمی اس وعدہ پر اونٹ خریدتا کہ جب اونٹی جنے پھر وہ بڑی ہو کر بنے تب قیمت دوں گا“
حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

((لَا تَبَايَعُوا إِلَى الْحَصَادِ وَالْدِّيَاسِ وَلَا تَبَايَعُوا إِلَّا إِلَى أَجَلٍ مَعْلُومٍ))

[ارواء الغلیل: ج ۵ ص ۲۱۷]

”فصل کا نئے یا گاہنے تک بیع نہ کرو بلکہ متعین مدت تک کرو“

ان دونوں صورتوں میں چونکہ مدت میں ابہام ہے اس لیے یہ جائز نہیں ہیں۔

✽ مخصوص باغ یا زمین کے مخصوص قطعہ کی پیداوار میں بیع مسلم نہیں ہو سکتی کیونکہ اس میں غرر پایا جاتا ہے۔ ممکن ہے وہ باغ پھل نہ دے یا قطعہ زمین میں فصل ہی نہ ہو۔ سعید بن سعد نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا:

((هَلْ لَكَ أَنْ تَبِيعَنِي ثَمْرًا مَعْلُومًا إِلَى أَجَلٍ مَعْلُومٍ مِنْ حَائِطِ بَنِي فُلَانٍ قَالَ لَا أَيْعُكَ مِنْ حَائِطٍ مُسَمًّى، بَلْ أَيْعُكَ أَوْ سَقًا مُسَمًّى إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى)) [فتح الباری: ج ۴ ص ۵۴۶]

”کیا آپ مجھے بنی فلاں کے باغ سے متعین مدت کے لیے متعین کھجوریں فروخت کریں گے۔ آپ نے فرمایا متعین باغ سے نہیں بلکہ متعین وقت متعین مدت کے لیے فروخت کرتا ہوں۔“

شیخ الاسلام حافظ ابن حجر رحمہ اللہ رقم طراز ہیں:

((وَنَقَلَ ابْنُ الْمُنْذِرِ اِتِّفَاقَ الْأَكْثَرِ عَلَى مَنَعِ السَّلَمِ فِي بُسْتَانٍ مُعِينٍ

لِأَنَّهُ غَرَرَتْ)) [حوالہ مذکورہ]

”ابن منذر نے متعین باغ میں سلم کی ممانعت پر اکثر کا اتفاق نقل کیا ہے۔“

ڈاکٹر علامہ محمد سلیمان اشقر لکھتے ہیں:

”دور حاضر میں اس کی بعض صورتوں میں نظر ثانی ہونی چاہے کیوں کہ بعض بڑی بڑی فیکٹریاں ایسی ہیں جن کی مصنوعات بہت زیادہ پھیلی ہوئی ہیں اور ان کی مصنوعات میں ایسی خوبیاں ہیں جو دوسری فیکٹریوں کی مصنوعات میں نہیں پائی جاتیں۔ جیسے مرسدیز کمپنی کی گاڑیاں یا توشیبا کے ٹیلی ویژن ہیں اگر کوئی مرسدیز گاڑی ۲۰۰ ماڈل ۱۹۹۳ء میں سلم کرنا چاہے تو یہ جائز ہونی چاہے بلکہ میرے نزدیک گاڑیوں میں اس وقت تک سلم درست نہیں جب تک فیکٹری کا نام ذکر نہ کرے۔ صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ گاڑی پانچ سیٹر اور فلاں سال کا ماڈل ہو کیونکہ قیمتوں کے فرق کی وجہ سے اس میں جہالت پائی جاتی ہے جو نزاع کا باعث بن سکتی ہے۔ گاڑیوں کے علاوہ دوسری بڑی فیکٹریوں جن کی پیداوار بازاروں میں عام ہے کا بھی یہی حکم ہے۔ البتہ مخصوص زرعی فارم اور محدود پیداوار کے حامل کارخانے کا یہ حکم نہیں کیونکہ اس کی پیداوار بند بھی ہو سکتی ہے۔“

[بحوث فقہیہ فی قضایا اقتصادیہ معاصرہ: ج ۱، ص: ۱۹۴-۱۹۵]

علامہ سلیمان اشقر کے خیال میں بعض مالکی فقہاء جیسے ابن شاس اور ابن الحاجب کے کلام سے بھی اس نقطہ نظر کی تائید ہوتی ہے۔ انہوں نے متعین باغ کے پھل میں سلم ناجائز ہونے کے ساتھ یہ شرط لگائی ہے ”کہ وہ باغ چھوٹا نہ ہو“ اور جانوروں میں یہ قید لگائی ہے ”کہ ان کا تعلق ایسی نسل سے نہ ہو جو کم پائی جاتی ہو“ اس کا مطلب ہے کہ باغ اگر بڑا اور جانور کی نسل زیادہ پائی جاتی ہو تو اس میں سلم غیر متعین ہی کی طرح ہے۔

مزید لکھتے ہیں کہ بعض فقہاء کے اس کلام ”کہ بڑی بستی کے پھل میں سلم جائز ہے لیکن اگر چھوٹی ہو تو پھر جائز نہیں“ سے بھی اس کو تقویت ملتی ہے [حوالہ مذکورہ]

ملاحظہ:

شیررز کے سودوں میں چونکہ کمپنی کا نام ذکر کرنا ضروری ہوتا ہے جس سے اس کی حیثیت متعین چیز میں سلم کی ہو جاتی ہے جو ناجائز ہے ممکن ہے جب سپردگی کا وقت آئے مارکیٹ میں اس کمپنی کے شیررز دستیاب نہ ہوں لہذا شیررز میں بیع سلم درست نہیں۔

سلم اور استصناع میں فرق:

استصناع کا معنی ہے آڈر پر کوئی چیز تیار کروانا۔ الٰہ حدیث علماء کی رائے میں یہ سلم کی ہی ایک قسم ہے جس کا تعلق ایسی اشیاء سے ہے جو آڈر پر تیار کروائی جاتی ہیں اور اس میں پابندیاں قدرے نرم ہیں۔ مثلاً اس میں پوری قیمت پیشگی ادا کرنا ضروری نہیں۔ ڈاکٹر علی احمد سالوس رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

((الاستصناع عند المالكية والشافعية والحنابلة جزء من السلم لا يصح الا بشروطه وهو عند الحنفية عدا زفر عقد مستقل له شروطه واحكامه الخاصة)) [موسوعة القضايا الفقهية المعاصرة والاقتصاد الاسلامي: ص ۸۴۲]

”مالکیوں، شافعیوں اور حنبلیوں کے نزدیک استصناع سلم کی ہی قسم ہے۔ جو سلم کی شرطوں کے بغیر درست نہیں ہوتی۔ البتہ امام زفر کے علاوہ باقی حنفیوں کے نزدیک یہ ایک مستقل عقد ہے جس کی اپنی شرطیں اور خاص احکام ہیں۔“

سلم میں رہن اور ضمانت طلب کرنا:

بیع سلم میں بیچی گئی چیز چونکہ فروخت کنندہ کے ذمہ ادھار ہوتی ہے لہذا خریدار حوالگی یقینی بنانے کے لئے رہن یا گارنٹی کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ ہم اوپر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے بیان کر آئے ہیں کہ قرآن حکیم کی آیت

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى

فَاكْتُبُوهُ﴾ [البقرة: ۲۸۲]

”اے ایمان والو! جب تم آپس میں مقرر وقت تک ادھار کا معاملہ کرو تو اس کو لکھ لیا کرو۔“

میں بیع سلم بھی شامل ہے جبکہ اس سے بعد والی آیت میں ادھار میں رہن کی اجازت دی گئی ہے۔ یعنی سلم میں رہن کا جواز قرآن سے ثابت ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کے حق میں بایں الفاظ **بَابُ الرَّهْنِ فِي السَّلَمِ** ”سلم میں رہن کا ثبوت“ عنوان باندھا ہے اور یہ روایت ذکر کی ہے۔ **اعمش** رحمہ اللہ کہتے ہیں:

((تَذَاكُرُنَا عِنْدَ إِبْرَاهِيمَ الرَّهْنُ فِي السَّلَمِ فَقَالَ حَدَّثَنِي الْأَسْوَدُ عَنْ عَائِشَةَ - رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا - أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اشْتَرَى مِنْ يَهُودِيٍّ طَعَامًا إِلَى أَجَلٍ مَعْلُومٍ، وَارْتَهَنَ مِنْهُ دِرْعًا مِنْ حَدِيدٍ))
[صحیح بخاری: باب الرهن فی السلم]

”ہم نے ابراہیم کے پاس سلم میں رہن کے متعلق گفتگو کی انہوں نے فرمایا مجھے اسود نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بیان کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی سے متعین مدت کے لئے غلہ خریدا اور اس کے پاس لوہے کی زرہ گروی رکھی“

سلم میں قبضہ کی مدت:

چونکہ حدیث و سنت میں بیع سلم میں قبضہ کی کم از کم مدت کے متعلق کوئی صراحت نہیں ملتی اس لیے اس بارہ میں فقہاء کا اختلاف ہے بعض کے نزدیک ایک گھڑی کی مہلت بھی کافی ہے جبکہ بعض نصف یوم بعض دو بعض تین اور بعض پندرہ یوم کے قائل ہیں۔ [عمدة القاری: ج ۸ ص ۵۸۱]

علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ کی رائے میں کم از کم اتنی مدت ہونی چاہیے جس کا قیمتوں پر مناسب اثر پڑتا ہو وہ ایک مہینہ یا اس کے قریب ہے۔ [المغنی ج ۶ ص ۴۰۴]

صحیح بات یہ ہے کہ فریقین کو باہمی رضا مندی سے کوئی بھی مدت مقرر کرنے کا اختیار ہے۔



❁ ایک تو اس لیے کہ ذخیرہ احادیث میں نبی ﷺ سے کم از کم مدت کے متعلق کوئی روایت منقول نہیں۔

❁ دوسرا اس لیے کہ سلم کی اجازت کا مقصد لوگوں کو سہولت دینا ہے یہ مقصد تب ہی حاصل ہو سکتا ہے جب مدت کی پابندی نہ ہو۔

حوالگی میں تاخیر پر جرمانہ:

سلم میں بیچی گئی چیز چونکہ فروخت کنندہ کے ذمے دین (ادھار) ہوتی ہے جس میں تاخیر پر جرمانہ صریح سود شمار ہوتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے:

((مَنْ أَسْلَفَ سَلْفًا فَلَا يَشْتَرِطُ إِلَّا قَضَاءً)) [موطا امام مالک: باب

مالايجوز من السلف]

”جو قرض دے وہ ادائیگی کے علاوہ کوئی شرط عائد نہ کرے۔“

اسلامی بینکوں کی رہنمائی کے لیے مرتب کردہ شریعہ سٹینڈرڈز میں ہے۔

((لَا يَحْجُوزُ الشَّرْطُ الْحُزَائِيُّ عَنِ التَّأَخِيرِ فِي تَسْلِيمِ الْمُسْلِمِ فِيهِ))

[ص ۱۶۲]

”جس چیز میں سلم کا سودا ہوا ہو اس کی تاخیر پر شرط جزائی جائز نہیں۔“

صفحہ ۷۷ میں ممانعت کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ جس چیز کا سودا ہوا ہے وہ بیچنے والے کے ذمہ دین ہے جس پر اضافہ کی شرط سود شمار ہوتی ہے۔

اگر فروخت کنندہ تنگ دستی کی وجہ سے بروقت چیز مہیا نہ کر سکے تو اس کو فراخ دستی تک موقع دیا جائے گا۔

اگر مطلوبہ چیز کی پیداوار کم ہونے یا بازار میں دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے بائع کے لیے بروقت سپردگی ممکن نہ ہو تو خریدار کے پاس دو اختیار ہوتے ہیں۔

۱۔ بازار میں آسانی سے دستیاب ہونے کا انتظار کرے۔

۲۔ سودا ختم کر کے اپنی رقم وصول کر لے۔ [المعايير الشرعية ص: ۱۶۲]

اگر عہد اتا خیری حربے استعمال کرے تو خریدار کو گارنٹی بیچنے کا بھی حق ہے، ایسی صورت میں خریدار کے پاس دو اختیار ہوں گے۔

✽ گارنٹی سے حاصل شدہ رقم سے اس قسم کی چیز بازار سے خرید لے۔

✽ یا اپنی اصل رقم وصول پالے۔

لیکن اضافی رقم خواہ جرمانے کے نام پر ہی کیوں نہ ہو وصول نہیں کی جاسکتی۔ بعض حضرات کی رائے میں اگر جرمانہ کی رقم قرض خواہ یا ادھار دینے والے کی آمدن کا حصہ نہ بنے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن یہ رائے صائب نہیں کیونکہ شرعاً قرض یا ادھار پر مشروط اضافہ سود کے زمرہ میں داخل ہے اس میں آمدن کا حصہ بننے یا نہ بننے کی شرط نہیں۔

قبضہ سے پہلے بیچنا:

”سلم کے ذریعے خریدی گئی چیز جب تک خریدار کے قبضہ میں نہ آجائے اس کو آگے فروخت کرنا منع ہے۔ کیونکہ یہ دین ہے جس کو بیچنا شرعاً درست نہیں علاوہ ازیں احادیث میں قبضہ سے قبل فروخت کی ممانعت ہے۔ چنانچہ علامہ ابن قدامہ لکھتے ہیں:

((أَمَّا بَيْعُ الْمُسْلِمِ فِيهِ قَبْضُهُ، فَلَا نَعْلَمُ فِي تَحْرِيمِهِ خِلَافًا، وَقَدْ نَهَى النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعِ الطَّعَامِ قَبْلَ قَبْضِهِ وَعَنْ رِبْحِ مَا لَمْ يُضْمَنْ وَلَآئِنَّهُ مَبِيعٌ لَمْ يَدْخُلْ فِي ضَمَانِهِ، فَلَمْ يَحْزُ بِبَيْعِهِ، كَالطَّعَامِ قَبْلَ قَبْضِهِ)) [المغنی: ج ۹ ص ۶۸]

”سلم کے ذریعے خریدی گئی چیز کو قبضہ سے قبل فروخت کرنے کی حرمت میں ہم کسی اختلاف کا علم نہیں رکھتے۔ بلاشبہ نبی ﷺ نے قبضہ سے قبل غلے کی بیع سے منع فرمایا ہے۔ اور اس چیز کے نفع سے بھی منع فرمایا ہے جس کا رسک نہ اٹھایا گیا ہو۔ اور یہ چیز تو ابھی اس کے رسک میں نہیں آئی لہذا اس کی بیع جائز نہیں جس طرح غلے کی قبضہ سے قبل بیع جائز نہیں۔“

نوٹ: اس چیز کی فروخت کا ایسا وعدہ جس کی پابندی دونوں یا کسی ایک فریق کے لیے

لازمی ہو وہ بھی اس ممانعت میں شامل ہیں۔

تجارت میں سلم کا استعمال:

کیا سلم کی اجازت صرف کاشتکاروں اور اشیاء تیار کرنے والوں کو ہے یا سپلائرز بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟ اس بارہ میں دو نقطہ نظر ہیں۔

۱۔ اکثر علماء کی رائے میں یہ رعایت تاجروں کے لیے بھی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ بھی اسی نقطہ نظر کے حامی ہیں چنانچہ انہوں نے اس کے حق میں ”باب السلم الی من لیس عنده أصل“ ”ایسے شخص سے سلم کا معاملہ کرنا جس کے پاس اس چیز کی اصل نہ ہو“ کے عنوان سے ایک مستقل باب باندھا ہے اور استدلال کے لیے ذیل کی روایت لائے ہیں۔

((قَالَ عَبْدُ اللَّهِ كُنَّا نُسَلِّفُ نَبِيطَ أَهْلِ الشَّامِ فِي الْحِنْطَةِ، وَالشَّعِيرِ، وَالزَّيْتِ، فَبِئْسَ مَعْلُومٌ، إِلَى أَجَلٍ مَعْلُومٍ قُلْتُ إِلَى مَنْ كَانَ أَصْلُهُ عِنْدَهُ قَالَ مَا كُنَّا نَسْأَلُهُمْ عَنْ ذَلِكَ)) [صحیح بخاری: باب السِّلْمِ إِلَى مَنْ لَيْسَ عِنْدَهُ أَصْلٌ]

”حضرت عبداللہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: ہم شام کے کاشتکاروں کے ساتھ گندم، جو، اور تیل میں متعین پیمانے اور متعین مدت کے لیے سلم کا معاملہ کرتے: محمد بن ابی مجالد رحمہ اللہ کہتے ہیں میں نے پوچھا: کیا ان سے جن کے پاس ان چیزوں کی اصل ہوتی؟ انہوں نے فرمایا: ہم ان سے اس کے متعلق نہیں پوچھتے تھے۔“

حضرت عبداللہ رحمہ اللہ کا مطلب ہے کہ ہم ان سے یہ نہیں پوچھتے تھے کہ تمہارے پاس گندم یا جو کی فصل ہے یا نہیں؟

اس نقطہ نظر کے حق میں دوسری روایت یہ پیش کی جاتی ہے۔

((كُنَّا نُسَلِّفُ فِي عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ فِي الْحِنْطَةِ وَالشَّعِيرِ وَالزَّيْتِ أَوْ التَّمْرِ شَكًّا فِي التَّمْرِ وَالزَّيْتِ

وَمَا هُوَ عِنْدَهُمْ أَوْ مَا نَرَاهُ عِنْدَهُمْ)) [مسند احمد: ۱۹۶۴]

”ہم رسول اللہ ﷺ ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے دور میں گندم، جو اور مٹی یا کہا کھجوروں میں (یعنی راوی کو یہ شک ہے کہ کھجور کا لفظ بولا یا متھے کا) بیع سلم کرتے حالانکہ وہ چیز ان کے پاس نہیں ہوتی تھی یا کہا ہم وہ ان کے پاس نہیں دیکھتے تھے“
اس نقطہ نظر کے قائلین کہتے ہیں یہ روایات اس امر کا بین ثبوت ہیں کہ سلم کی اجازت سلاڑ کے لیے بھی ہے۔

۲۔ دوسری رائے یہ ہے کہ سلم کی اجازت صرف کاشتکاروں اور مینوفیکچررز کو ہے۔ ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ کاشتکار اور چیز تیار کرنے والا جب سلم کے ذریعے چیز بیچتا ہے تو غالب گمان یہی ہوتا ہے مدت حوالگی کے وقت وہ چیز اس کے پاس موجود ہوگی اس کو دوسرے سے خریدنے کی ضرورت پیش نہیں آئی گی گویا وہ اپنی ملکیتی چیز بیچ رہا ہے اس کے برعکس سلاڑ جب سلم کا معاہدہ کرتا ہے تو وہ چیز اس کے پاس موجود نہیں ہوتی شریعت نے غیر ملکیتی چیز کا سودا کرنے پر پابندی لگائی ہے حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((سَأَلْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ يَأْتِنِي

الرَّجُلُ فَيَسْأَلُنِي الْبَيْعَ لَيْسَ عِنْدِي أَيْبَعُهُ مِنْهُ ثُمَّ أَتَاغُهُ لَهُ مِنَ السُّوقِ))

”میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ میرے پاس ایک آدمی آتا ہے وہ مجھے ایسی

چیز بیچنے کو کہتا ہے جو میرے پاس نہیں ہوتی کیا میں اس کو بیچ دوں پھر وہ بازار سے خرید

کر اس کو دے دوں۔“

اس پر آپ نے فرمایا:

((لَا تَبِعْ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ)) [سنن النسائي: باب يَبِعُ مَا لَيْسَ عِنْدَ الْبَائِعِ]

”جو چیز تیرے پاس نہیں وہ فروخت نہ کر۔“

ان حضرات کے خیال میں حضرت حکیم رضی اللہ عنہ کا سوال تجارت میں سلم کے متعلق ہی تھا

مگر آپ نے اس کی اجازت نہ دی اور نہ ہی آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ اگر اس کی صفات بیان کر دی گئی ہوں تو پھر جائز ہے۔ ان حضرات کی تحقیق میں جو روایات اول الذکر فریق نے پیش کی ہیں وہ ان کے موقف کے ثبوت کے لیے ناکافی ہیں۔ پہلی روایت کا مفہوم صرف اتنا ہے کہ خریدار کو فروخت کنندہ سے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں کہ آپ کے پاس کھیتی یا باغ ہے یا نہیں۔ [بحوث فی فقہ المعاملات المالیه: ص ۱۳۴، ۱۳۷، ۱۳۹] للدکتور رفیق یونس المصری

ان حضرات کی طرف سے دوسری روایت کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اس کا مطلب ہے کہ جو چیز سلم میں فروخت کی جا رہی ہے اس کا معاہدے کے وقت پایا جانا ضروری نہیں جیسا کہ بعض فقہاء کی رائے ہے کہ وہ چیز معاہدہ طے پانے کے دن سے قبضہ کے دن تک بازار میں دستیاب ہو۔

جو حضرات سلا رز کو سلم کی اجازت دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کے فرمان ”جو چیز تیری ملکیت میں نہیں اس کو فروخت نہ کر“ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ تا جر سلم سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اس ارشاد کا معنی صرف یہ ہے کہ ایسی متعین چیز فروخت نہ کر جو تیرے قبضہ میں نہ ہو بلکہ غیر کی ملکیت ہو۔ چنانچہ امام ابن قیم رحمہ اللہ اس کی تشریح میں رقمطراز ہیں:

((وَأَمَّا قَوْلُ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِحَكِيمِ بْنِ حِزَامٍ (لَا تَبِعْ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ) فَيَحْمِلُ عَلَى مَعْنَيْنِ أَحَدُهُمَا أَنْ يَبِيعَ عَيْنًا مُعَيَّنَةً وَهِيَ لَيْسَتْ عِنْدَهُ، بَلْ مِلْكٌ لِلْغَيْرِ، فَيَبِيعُهَا ثُمَّ يَسْعَى فِي تَحْصِيلِهَا وَتَسْلِيمِهَا إِلَى الْمُشْتَرِي وَالثَّانِي أَنْ يُرِيدَ يَبِيعَ مَا لَا يَقْدِرُ عَلَى تَسْلِيمِهِ وَإِنْ كَانَ فِي الذَّمَّةِ)) [اعلام الموقعين: ج ۲ ص ۴۶]

”حکیم بن حزام سے نبی ﷺ کا یہ فرمانا کہ ”جو چیز تیری ملکیت میں نہیں وہ فروخت نہ کر، اس کو دو معنوں پر محمول کیا جائے گا۔

۱۔ انسان ایسی متعین چیز بیچے جو اس کے پاس موجود نہ ہو بلکہ غیر کی ملکیت ہو۔ آدمی پہلے

اس کو بیچے پھر حاصل کر کے مشتری کے حوالے کرنے کی کوشش کرے۔

۲۔ ایسی چیز کا سودا کرے جس کو (مشتری کے) حوالے نہ کر سکتا ہو خواہ ذمہ داری اٹھائے۔
 بیع سلم میں دونوں باتیں نہیں ہوتیں کیونکہ یہاں تو صرف بیان شدہ صفات کے مطابق ایک چیز فروخت کرنے کی ذمہ داری قبول کی جاتی ہے۔

اسلامی بینکوں میں سلم کا استعمال:

بلاشبہ سلم ایک بہترین غیر سودی طریقہ تمویل ہے جو عصر حاضر میں بھی لوگوں خصوصاً کاشتکاروں اور مینوفیکچررز کی مالی ضرورتیں پوری کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے اور بعض اسلامی بینک اس سے فائدہ بھی اٹھا رہے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں اسلامی بینک اس کی عملی تطبیق میں گڑبڑ کرتے ہیں جس سے یہ معاملہ شرعی اصول کے مطابق نہیں رہتا۔ وہ یوں کہ گنے کے سیزن میں شوگر ملوں کو گنا خریدنے کے لیے رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔ ملز مالکان چاہتے ہیں کہ ہمارا مقصد بھی پورا ہو جائے اور ہم سود سے بھی محفوظ رہیں اب وہ اسلامی بینک کی طرف رجوع کرتے ہیں بینک اس شرط پر رقم فراہم کرتا ہے کہ آپ نے ہمیں اس کے عوض فلاں تاریخ تک اتنی چینی مہیا کرنی ہے یعنی بینک سلم کا معاہدہ کر لیتا ہے شوگر ملز کی طرف سے فراہمی یقینی بنانے کے لیے بینک ضمانت بھی طلب کرتا ہے چونکہ بینک کاروباری ادارہ نہیں جو آگے بیچنے کے لے گا ہگ تلاش کرتا پھرے اس لیے معاہدے کے وقت ہی یہ بھی طے کر لیا جاتا ہے کہ مل مالک بینک کے وکیل کی حیثیت سے یہ چینی مارکیٹ میں اس قیمت پر فروخت کر کے رقم بینک کے سپرد کرے گا۔ بعض دفعہ معاہدے کے وقت اس کی صراحت نہیں ہوتی مگر فریقین کے ذہن میں یہی ہوتا ہے۔ اگر شوگر مل بروقت چینی فراہم نہیں کرتی تو بینک دی گئی رقم کے فیصد کے حساب سے جرمانہ وصول کرتا ہے جو بینک کی زیر نگرانی قائم خیراتی فنڈ میں جمع کروایا جاتا ہے۔

بینک کا خود قبضہ کرنے کی بجائے فروخت کنندہ کو ہی وکیل بنانا شرعی اصول کے

خلاف ہے۔

چنانچہ علماء احناف کے سرخیل علامہ سرحسی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

((وَلَوْ قَالَ رَبُّ السَّلَامِ لِلْمُسْلِمِ إِلَيْهِ كُلُّ مَالِي عَلَيْكَ مِنَ الطَّعَامِ فَأَعَزَّهُ فِي بَيْتِكَ أَوْ فِي غَرَارِكَ فَفَعَلَ ذَلِكَ لَمْ يَكُنْ رَبُّ السَّلَامِ قَابِضًا بِمَنْزِلَةِ قَوْلِهِ اقْبِضْهُ لِي يَسَارِكَ مِنْ يَمِينِكَ وَهَذَا لِأَنَّ الْمُسْلِمَ فِيهِ دَيْنٌ عَلَى الْمُسْلِمِ إِلَيْهِ وَالْمَدْيُونُ لَا يَصْلُحُ أَنْ يَكُونَ نَائِبًا عَنْ صَاحِبِ الدَّيْنِ فِي قَبْضِ الدَّيْنِ مِنْ نَفْسِهِ)) [المبسوط: ج ۱۵ ص ۱۰۱]

”اس کا مطلب یہ ہے کہ سلم کے ذریعے بیچی گئی چیز فروخت کنندہ کے ذمہ ادھار ہوتی ہے اور جس کے ذمہ ادھار ہو وہ خود اپنی ذات سے اس کی وصولی کے لیے اس شخص کا وکیل نہیں بن سکتا جس کا اس کے ذمہ ادھار ہو۔“

علامہ ڈاکٹر محمد سلیمان اشقر سلم سے اسلامی بینکوں کے فائدہ اٹھانے کے طریقہ کار کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

((الطريقة الثانية: أن يوكل المصرف البائع (المسلم اليه) بتسويق البضاعة بأجر أو دون أجر فإن كان باتفاق معه مسبقاً مربوط بعقد السلم نفسه فإن ذلك باطل لا يجوز، لأنه من باب جمع عقدين في عقد واحد. وكذا لو كان الأمر متفاهماً عليه أن يتم بهذه الصورة.)) [بحوث فقيهة في قضايا اقتصادية معاصرة: ج ۱ ص: ۲۱۴]

”دوسرا طریقہ یہ ہے کہ بینک چیز کی مارکیٹنگ کے لیے فروخت کنندہ کو ہی اپنا وکیل مقرر کر دے خواہ اس کی اجرت دے یا نہ دے۔ تو اگر یہ وکالت پہلے سے عقد سلم سے مربوط ایگر منٹ کے ذریعے ہو تو یہ عمل باطل ہوگا جو جائز نہیں کیونکہ یہ ایک عقد میں دو عقد جمع کرنے کے مترادف ہے اور اگر (ایگر منٹ ٹون ہو مگر) پہلے ہی سے ذہن میں یہ ہو کہ معاملہ اس طرح تکمیل کو پہنچے گا تو پھر بھی یہ جائز نہیں۔“

سلم متوازی:

یہاں یہ بتا دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی بینکوں میں سلم سے فائدہ اٹھانے

کا جو طریقہ اسلامی بینکنگ کے ماہرین نے تجویز کیا ہے اس کو سلم متوازی کہتے ہیں۔ یعنی بینک کسی تیسرے فریق کے ساتھ سلم کا معاہدہ کر لے۔ جس کی تاریخ ادائیگی پہلی سلم والی ہی ہو۔ متوازی سلم میں مدت کم ہونے کی وجہ سے قیمت زیادہ ہوگی اور یوں دونوں قیمتوں میں فرق بینک کا نفع ہوگا۔ مگر ہمارے ہاں اسلامی بینکوں میں یہ طریقہ شاذ و نادر ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ زیادہ تر فروخت کنندہ کو ایجنٹ بنانے کا طریقہ ہی اختیار کیا جاتا ہے۔ جو شرعاً درست نہیں۔

پراپیگیٹڈہ کا جواب:

مروجہ اسلامی بینکوں کے حامی یہ پراپیگیٹڈہ بھی کرتے ہیں کہ اسلامی بینکوں نے شریعہ ایڈوائزر رکھے ہوئے ہیں جو تمام امور کی نگرانی کرتے ہیں اگر اسلامی بینکوں میں شرعی اصولوں کا پورا خیال نہیں رکھا جاتا تو وہ تائید کیوں کرتے ہیں۔ ہم اس کے جواب میں اپنی طرف سے کچھ کہنے کی بجائے اسلامی بینکاری کے حامی اور متحدہ عرب امارات میں Emirates Islamic Bank کے شریعہ بورڈ کے ممبر جناب عبدالعظیم ابوزید کے ایک بیان کا حوالہ دینا کافی سمجھتے ہیں جو ۱۵ اپریل ۲۰۰۸ء کو I.B.F Net پر شائع ہو چکا ہے۔ اس کے مطابق انہوں نے دبئی میں اسلامک فنانس فورم میں تقریر کرتے ہوئے واضح الفاظ میں کہا کہ شریعہ سکالر کرپٹ ہو چکے ہیں اور بینک صرف انہیں کے پاس جاتے ہیں جو ان کے حق میں ہوتے ہیں انہوں نے Arabian Business.Com کو انٹرویو دیتے ہوئے یہ بھی کہا کہ اسلامک فنانس

سیکٹر خطرے میں ہے۔ انہوں نے کہا کہ بینک کا صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ نفع کمانا اس لحاظ سے کنٹنشل اور (رائج) اسلامک فنانس میں کوئی فرق نہیں۔

خلاصہ

مذکورہ بالا تفصیل سے حسب ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں۔

✽ مروجہ اسلامی بینکاری سودی بینکاری کا ہی چرہ ہے مگر تاویلات کے ذریعے اس کو جائز

ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی جا رہی ہے۔

❁ اسلامی بینکوں میں رائج مضاربہ، اجارہ، مراہجہ، مشارکہ متناقصہ، تورق اور سلم شرعی

مضاربہ، اجارہ اور مراہجہ وغیرہ سے مختلف ہیں۔

❁ اسلامی بینکوں کی کوئی بھی پراڈکٹ شرعی اصول سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ لہذا ان سے

اتحراز واجب ہے۔



تکافل

مروجہ اسلامی انشورنس

کچھ عرصہ سے بعض مالیاتی ادارے اسلامی بینکوں کی طرز پر سود، غرر اور قمار پر مشتمل انشورنس کا متبادل نظام بڑے زور و شور سے متعارف کر رہے ہیں جس کو تکافل کا نام دیا گیا ہے۔ جو ادارہ اس کا انتظام و انصرام کرتا ہے اس کو تکافل کمپنی کہا جاتا ہے جیسے پاک کویت جنرل تکافل کمپنی یا پاک قطر فیملی تکافل کمپنی وغیرہ۔ ان کمپنیوں کے بقول یہ نظام چونکہ ہر لحاظ سے شرعی اصولوں کے عین مطابق ہے اس لیے اس کو اسلامی انشورنس بھی کہا جاتا ہے۔ چونکہ اس کام سے ان اداروں کی غرض نفع کمانا ہے اس لیے ہم اس کو تجارتی تکافل بھی کہہ سکتے ہیں۔ تکافل کا مفہوم اور شرعی تصوّر کیا ہے شرعی اور تجارتی تکافل میں بنیادی فرق کیا ہے نیز تجارتی تکافل کی شرعی اساس اور حکم کیا ہے؟ ذیل میں ان سوالوں کے جوابات ملاحظہ فرمائیں۔

تکافل کا معنی و مفہوم:

ہماری معلومات کے مطابق قرآن و حدیث اور لغت کی قدیم کتب میں تکافل کا لفظ مذکور نہیں ہاں کتاب و سنت میں ایسے الفاظ ضرور استعمال ہوئے ہیں جن کا مادہ وہی ہے جو تکافل کا ہے یعنی ”ک ف ل“ سے بنے ہیں۔ مثلاً قرآن حکیم میں حضرت مریم علیہا السلام کی کفالت اور تربیت کے حوالے سے ایک جگہ:

﴿فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَأَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا﴾

[آل عمران: ۳۷]

”پھر اس کے رب نے اسے قبول کیا قبول کرنا اچھا اور زکریا کو اس کا کفیل بنایا۔“

اور دوسری جگہ:

﴿إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ﴾ [آل عمران: ۴۴]

”جب وہ اپنے قلم ڈال رہے تھے کہ ان میں سے کون مریم کی کفالت کرے۔“

یعنی پہلی آیت میں لفظ ”كَفَّلَ“ کفیل ”بنایا اور دوسری میں ”يَكْفُلُ“ کفالت کرے، کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

جب دو آدمی دیوار پھلانگ کر حضرت داؤد علیہ السلام کے کمرہ میں داخل ہوئے تو ان میں سے ایک نے کہا:

﴿إِنَّ هَذَا أَخِي لَهُ تِسْعٌ وَتِسْعُونَ نَعَجَةً وَلِيَ نَعَجَةً وَاحِدَةً فَقَالَ

أَكْفُلْنِيهَا وَعَزَّنِي فِي الْخِطَابِ ۝﴾ [ص: ۲۱]

”بے شک یہ میرا بھائی ہے اس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس ایک ہی

دنبی ہے تو یہ کہتا ہے وہ بھی میرے سپرد کر دے اور گفتگو میں مجھ پر غالب آجاتا ہے“

یہاں ”أَكْفُلْ“ سپرد کر دے“ کا لفظ آیا ہے۔

اسی طرح حدیث میں بھی اس مادہ کے مختلف الفاظ آئے ہیں۔ مثلاً نبی ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((أَنَا وَكَافِلُ الْيَتِيمِ فِي الْجَنَّةِ هَكَذَا)) [صحیح بخاری: کتاب

الادب، باب فضل من يعول]

”میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح اکٹھے ہوں گئے آپ نے

آنشت شہادت اور درمیانی انگلی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا جیسے یہ دونوں اکٹھے ہیں“

البتہ لغت کی جدید کتب میں یہ لفظ زیر بحث آیا ہے۔ چنانچہ المورد میں تکافل کا معنی:

Joint liability or responsibility; solidarity ”مشترکہ ذمہ داری یا جواب

دہی؛ باہمی اتفاق؛ مقاصد اور عمل کا اتحاد“ لکھا ہے۔

معجم الطلاب میں ہے:

((تَكَافُلٌ يَتَكَافَلُ، تَكَافُلًا: تَضَامَنَ / تَبَادَلَ الضَّمَانَةُ مَعَ غَيْرِهِ))

”دوسرے کے ساتھ گارنٹی کا تبادلہ کرنا۔“

معجم لغة الفقهاء میں تکافل کا معنی و مفہوم یوں بیان ہوا ہے:

((تبادل الاعالة و النفقة و المعونة (Solidarity) الرعاية

و التحمل، و منه تكافل المسلمي ن رعاية بعضهم بعضا بالنصح

و النفقة و غير ذلك))

”کفالت، نفقہ اور اعانت کا تبادلہ (انگریزی میں سولیڈیرٹی) خیال رکھنا اور برداشت

کرنا اور اسی سے تکافل المسلمین ہے۔ یعنی مسلمانوں کا ایک دوسرے کا خیر خواہی

اور خرچ و غیرہ کر کے خیال رکھنا۔“

اسلام میں تکافل کی اہمیت:

اگرچہ قرآن و حدیث میں لفظ تکافل ذکر نہیں ہوا مگر ایک دوسرے کی ضرورتوں کا خیال

رکھنا، خیر خواہی اور تعاون کرنا دین کا اہم مطالبہ ہے۔ سید قطب شہید رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

((ان التكافل الاجتماعي هو قاعدة المجتمع الاسلامي و

الجماعة المسلمة مكلفة أن ترعى مصالح الضعفاء فيها))

[فی ظلال القرآن: ج ۱ ص ۲۱۲]

”بلاشبہ اجتماعی تکافل ہی اسلامی معاشرہ کی بنیاد ہے اور مسلمانوں کی جماعت

پابند ہے کہ وہ اپنے کمزوروں کے مفادات کا خیال رکھے۔“

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

((كان النظام الاسلامي كله يقوم على اساس التكافل))

[ج ۳ ص: ۴۳۳]

”اسلام کا مکمل نظام تکافل کی بنیاد پر قائم ہے“

ذیل میں اس موضوع کی بعض آیات اور احادیث نبویہ ﷺ ملاحظہ ہوں:

﴿وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ
بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ
الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ
عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾ [التوبة: ۷۱]

”مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں وہ نیکی کا حکم دیتے اور
برے کام سے روکتے ہیں اور نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے
رسول کی اطاعت کرتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ ضرور رحم فرمائے گا۔
شک اللہ تعالیٰ نہایت غالب خوب حکمت والا ہے۔“
یعنی اہل ایمان کا شعار یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہیں۔ مکافل کی
روح بھی یہی ہے۔

علامہ محمد رشید رضا رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

((ولاية المؤمنين والمؤمنات بعضهم لبعض في هذه الآية تعميم ولاية
النصرة، وولاية الأخوة والمودة)) [تفسير المنارج: ۱۰ - ص ۴۷۰]
”اس آیت میں مومن مردوں اور مومن عورتوں کی جس دوستی کا ذکر ہے وہ نصرت،
اخوت اور محبت سب دوستیوں کو شامل ہے۔“

✽ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک
سفر میں تھے اچانک ایک شخص اپنی سواری پر آیا اور دائیں بائیں دیکھنے لگا یعنی اپنی
ضرورت کی چیز تلاش کرنے لگا اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ كَانَ مَعَهُ فَضْلٌ فَلْيُعِدْ بِهِ عَلَى مَنْ لَا ظَهَرَ لَهُ وَمَنْ كَانَ
لَهُ فَضْلٌ مِنْ زَادٍ فَلْيُعِدْ بِهِ عَلَى مَنْ لَا زَادَ لَهُ)) [صحیح مسلم:

کتاب اللقطة، باب استحباب المؤاساة بفضول المال]

”جس کے پاس زائد سواری ہے وہ اس کو دے دے جس کے پاس سواری نہیں ہے

اور جس کے پاس زائد راشن ہو وہ اس کو دے دے جس کے پاس راشن نہیں ہے۔ راوی کہتے ہیں آپ ﷺ نے مال کی جو اصناف ذکر کی سو کی یہاں تک کہ ہم نے یہ سمجھا کہ زائد میں ہم میں سے کسی کا حق نہیں ہے۔“

اسلام کہتا ہے اگر ایک مسلمان کو تکلیف ہو تو دنیا بھر کے مسلمان اس وقت تک بے چین رہیں جب تک اس کی تکلیف رفع نہ ہو جائے۔ آپ ﷺ نے بڑی عمدہ مثال بیان کر کے اس کو یوں سمجھایا:

((تَرَى الْمُؤْمِنِينَ فِي تَرَاحُمِهِمْ وَتَوَادُّهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ إِذَا اشْتَكَى عُضْوًا تَدَاعَى لَهُ سَائِرُ جَسَدِهِ بِالسَّهْرِ وَالْحُمَى))

[صحیح بخاری: کتاب الادب، باب رحمة الناس والبهائم]
”تو مسلمانوں کو ایک دوسرے پر رحم کرنے، محبت رکھنے اور شفقت کرنے میں ایک جسم کی مانند دیکھے گا اگر ایک عضو بیمار ہو جاتا ہے تو تمام اعضاء بخار اور بیداری میں اس کے شریک ہوتے ہیں۔“

ایک موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا اللہ کی قسم اگر اللہ تعالیٰ یہ قحط ختم نہ کرتے:
((مَا تَرَكَتُ أَهْلَ بَيْتٍ مِنَ الْمُسْلِمِينَ لَهُمْ سَبْعَةٌ إِلَّا أَدْخَلْتُ مَعَهُمْ أَعْدَادَهُمْ مِنَ الْفُقَرَاءِ)) [الادب المفرد: باب المواساة في السنة والمجاعة]

”میں ہر صاحب حیثیت مسلمان گھرانے میں اتنے ہی غرباء داخل کر دیتا۔“
یعنی ایک خوشحال خاندان میں جتنے افراد ہوتے اتنے ہی غرباء کی کفالت ان پر لازم ہوتی۔

اسلامی تکافل کی ہمہ گیریت:

اسلام کا نظام تکافل اسلامی اخوت، معاشی احتیاج و ضرورت اور تکریم انسانیت پر استوار ہے۔ اسلام اس سوچ کا قطعاً حامی نہیں کہ ہم پر صرف ان مستحقین کی ذمہ داری عائد

ہوتی ہے جو ہمارے ہم عقیدہ ہوں۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

﴿لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾ [الممتحنة: ۸]

”اللہ تعالیٰ تمہیں ان لوگوں سے حسن سلوک کرنے اور ان کے حق میں انصاف کرنے سے نہیں روکتا جو تم سے دین کی بابت نہیں لڑے اور جنہوں نے تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا۔ بلاشبہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔“

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((فِي كُلِّ ذَاتِ كَبِدٍ رَطْبَةٌ أَجْرٌ)) [صحیح بخاری: کتاب المظالم]

باب الآبار على الطرق إذا لم يتأذ بها]

”ہر جاندار میں ثواب ہے، یعنی ہر جاندار کے ساتھ احسان کرنا باعث ثواب ہے۔“

فقہائے اسلام کی رائے میں جو اہل ذمہ اپنے معاش کے حصول سے عاجز ہو جائیں ان کی ضرورت کے مطابق بیت المال سے وظیفہ جاری کیا جائے گا۔ چنانچہ امام ابن قیم رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

((قد روى عنه وأنه أجرى على شيخ منهم من بيت المال، وذلك

أنهم ربه و هو يسأل على الأبواب. و فعله عمر بن عبد العزيز))

[احکام اہل الذمۃ، باب من لا یقدر من اہل الذمۃ أعطى من بیت المال]

”حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک ذمی بوڑھے کو دروازوں پر مانگتے

دیکھا تو بیت المال سے اس کا وظیفہ جاری کر دیا اور عمر بن عبد العزیز نے بھی ایسا کیا تھا“

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اہل حیرہ سے کہا تھا تم میں سے جو بوڑھا ہو جائے گا یا جس پر کوئی

آفت آجائے گی یا جو مالدار رہنے کے بعد غریب ہو جائے گا وہ جب تک دارالاسلام میں رہے گا

اس کی اور اس کے بیوی بچوں کی کفالت بیت المال کرے گا۔“ [کتاب الخراج قاضی ابو یوسف]

ثابت ہوا اسلام کے نظام تکافل کا فیض انتہائی وسیع ہے جس سے اسلامی ریاست کا ہر مستحق شہری بلا تخصیص عقیدہ بقدر ضرورت مستفید ہوتا ہے۔

تکافل کی مختلف صورتیں:

اسلامی نقطہ نظر کے مطابق درجات معیشت میں تفاوت اپنی جگہ مگر اس طرح سادہ زندگی گزارنے کا حق سب کو یکساں ہے کہ اس کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔ اس امر کو یقینی بنانے کے لیے زکوٰۃ، عشر اور صدقہ فطر وغیرہ کا نظام دیا گیا ہے۔ اور معاشرہ میں دولت کو زیر گردش لانے اور غرباء کی بہبود میں زکوٰۃ کا کردار بڑا نمایاں ہے۔ سید قطب شہید رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

((ان الزکاة فرع من فروع نظام التكافل الاجتماعي في

الاسلام)) [فی ظلال القرآن: ج ۴ - ص ۴۱]

”زکوٰۃ اسلام میں تکافل اجتماعی کی شاخوں میں سے ایک شاخ ہے۔“

رمضان المبارک کے اختتام پر صدقہ فطر بھی تکافل اجتماعی کی ایک شکل ہے تاکہ چھوٹے سے لے کر بڑے تک ہر شخص فقراء و مساکین کی دیکھ بھال میں حصہ دار بنے۔ مالداروں کو فقراء اقرباء کے نان و نفقہ کا ذمہ دار ٹھہرانا بھی تکافل میں شامل ہے جبکہ نفلی صدقات اور ہنگامی حالات میں انفاق کا حکم الگ ہے۔ اسی طرح غیر ارادی طور پر قتل ہو جانے کی صورت میں دیت تہا قاتل پر ڈالنے کی بجائے عاقلہ (قاتل کے بھائی، چچا اور ان کی اولاد) کو بھی شریک کرنے کا حکم تکافل کی ہی عکاسی کرتا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن قدامہ حنبلی رحمۃ اللہ علیہ اس کی حکمت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

((وَالْمَعْنَى فِي ذَلِكَ أَنَّ جَنَايَاتِ الْخَطَا تَكْثُرُ، وَدِيَّةُ الدَّامِي كَثِيرَةٌ

، فَلْيُسْحَبْهَا عَلَى الْجَانِي فِي مَالِهِ يُخَفِّفُ بِهِ، فَاتَّقَنَصَتْ الْحِكْمَةُ

إِسْحَابَهَا عَلَى الْعَاقِلَةِ، عَلَى سَبِيلِ الْمُوَاسَاةِ لِلْقَاتِلِ، وَالْإِعَانَةِ لَهُ،

تَخْفِيفًا عَنْهُ)) [المعنى: ج ۱۲ - ص ۲۱]

”اس میں حکمت یہ ہے غیر ارادی طور پر ہونے والے جرائم بکثرت ہوتے ہیں اور آدمی کی دیت بھی کافی زیادہ ہے۔ لہذا اس کو اکیلے خطا کار کے مال میں واجب قرار دینا اس پر اس کے مال میں ناقابل برداشت ذمہ داری ڈالنے کا باعث ہے چنانچہ حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ قاتل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے بطور ہمدردی اور اعانت کے اس کی عاقلہ پر واجب قرار دی جائے۔“

بلکہ غیر ارادی قتل میں دیت کا حکم بذات خود تکافل کی ایک صورت ہے وہ یوں کہ بعض دفعہ مقتول کے بچے کسن ہوتے ہیں جن کی تعلیم و تربیت کے لیے پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے اسلام نے دیت مقرر کر کے ان کی کفالت کا انتظام کیا ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ اسلام نے تکافل کا ایک مضبوط نظام دیا ہے اگر اس پر عمل ہو جائے تو تمام محتاجوں کی معاشی ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں۔ لیکن بایں ہمہ اگر ضرورت پوری نہ ہو تو سرمایہ داروں پر مزید خرچ کرنا لازم ہو جاتا ہے۔

اسلامی تکافل کی خصوصیت:

اسلامی تکافل کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا بنیادی مقصد اپنے مستقبل کے خطرات کا تحفظ اور نقصانات کی تلافی ہرگز نہیں۔ اور نہ ہی اس کو بطور کاروبار اختیار کیا جانا چاہیے اسلامی معاشرے کا یہ شعار ہونا چاہیے کہ اس کے تمام افراد باہم مددگار و معاون ہوں اور ضرورت مندوں اور مجبوروں کی مدد کریں لیکن اگر کچھ ادارے تکافل کے نام سے یہ مطالبہ کریں کہ ہم آپ کے بیوی بچوں کی مدد تب کریں گے جب آپ اتنے سالوں تک ہر ماہ ایک متعین رقم ہمیں وکالہ یا مضاربہ کی بنیاد پر کاروبار اور وقف فنڈ میں بطور چندہ دیں گے تو اس سے اسلام کے تکافل اجتماعی کا مقصد حاصل نہیں ہوگا۔

مروجہ تکافل اور اس کا طریقہ کار:

ماضی قریب میں تکافل کی ایک نئی شکل سامنے آئی ہے جس کا مقصد دوسروں کے ساتھ تعاون کی بجائے دراصل اپنے نقصان کا ازالہ ہوتا ہے اور اس کے منتظم بھی یہ کام بطور

کاروبار کرتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ

✽ سب سے پہلے کچھ لوگ یا مالیاتی ادارے مل کر ایک کمپنی قائم کرتے ہیں جس کو تکافل کمپنی کہا جاتا ہے کمپنی کے ادا شدہ سرمایہ کا ایک حصہ وقف کر کے ایک پول بنایا جاتا ہے یہ پول کسی کی ملکیت نہیں ہوتا بلکہ اپنا الگ قانونی وجود رکھتا ہے کمپنی کی طرف سے پول میں ڈالی گئی رقم ان متاثرین کے لیے وقف ہوتی ہے جو پالیسی حاصل کرتے ہیں۔

✽ کمپنی مالکان وقف کی اس رقم کو وقف کے ایجنٹ کی حیثیت سے یا مضاربہ کی بنیاد پر کاروبار میں لگاتے ہیں نفع سے اپنی فیس یا حصہ الگ کر کے باقی دوبارہ وقف پول میں ہی جمع کر دیا جاتا ہے۔

✽ کمپنی لوگوں کو پالیسی حاصل کرنے کی ترغیب دیتی ہے جو لوگ پالیسی حاصل کرتے ہیں وہ اس کے ممبران شمار ہوتے ہیں۔

✽ پالیسی حاصل کرتے وقت خواہش مند اپنی اغراض پیش نظر رکھتے ہیں۔ کسی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ میری موت کے بعد میرے بچوں کی کفالت کے لیے ان کے پاس بیس لاکھ ہونا چاہیے۔ کسی کے پیش نظر خاص قسم کے متوقع نقصان کا ازالہ کرنا ہوتا ہے۔

✽ صرف وہی لوگ پالیسی حاصل کرنے کے اہل شمار ہوتے ہیں جو عمر و صحت اور انکم کے لحاظ سے کمپنی کے معیار پر پورا اترتے ہیں۔ باقاعدہ طبی معائنہ کے ذریعہ ایک اندازہ کیا جاتا ہے۔ اگر کسی چیز کے متوقع نقصان کی تلافی مقصود ہو تو اس چیز کی حالت بھی دیکھی جاتی ہے۔

✽ پالیسی کی زیادہ سے زیادہ مالیت کیا ہوگی یہ فیصلہ خواہشمند نے خود کرنا ہوتا ہے۔ کم از کم مالیت تکافل کمپنی طے کرتی ہے۔

✽ پالیسی کی زیادہ سے زیادہ مدت کمپنی طے کرتی ہے البتہ کم سے کم مدت کا تعین وہ شخص خود بھی کر سکتا ہے۔ یاد رہے کمپنی کی جانب سے پالیسی ہولڈر کو دی جانے والی رقم کا

انحصار انہی دو باتوں پر ہوتا ہے۔

❁ چونکہ تکافل فنڈ کا انتظام و انصرام کمپنی کے ذمہ ہوتا ہے کمپنی اس کی باقاعدہ فیس لیتی ہے جس کو کوالہ فیس کہا جاتا ہے۔

❁ پالیسی کی رقم عموماً سالانہ اقساط میں جمع کروائی جاتی ہے جبکہ ششماہی یا سہ ماہی اقساط میں بھی کروائی جاسکتی ہے۔

❁ پالیسی ہولڈر کی قسط سے سب سے پہلے ایلوکیشن فیس منہا کی جاتی ہے یہ فیس پالیسی مالیت اور مدت کو مد نظر رکھ کر لی جاتی ہے پہلی قسط سے ایک خطیر رقم اس مد میں چلی جاتی ہے۔ مثلاً اگر پالیسی کی مدت ۲۰ سال یا اس سے زیادہ ہو اور قسط پندرہ سے پچیس ہزار تک ہو تو پاک قطر فیملی تکافل پہلی سالانہ قسط سے ۸۰ دوسری سے ۲۰ تیسری سے ۱۰ چوتھی سے ۷ پانچویں سے بھی ۷ چھٹی سے لے کر دسویں تک تین فیصد وصول کرتی ہے۔

❁ ایلوکیشن فیس کے بعد ہر قسط کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ایک حصہ انوسٹمنٹ کیلئے اور دوسرا حصہ وقف پول کے لیے۔

❁ جو حصہ انوسٹمنٹ کے لیے ہوتا ہے اس سے دو قسم کی فیس کاٹی جاتی ہے۔

۱۔ ایڈمن فیس: یہ ماہانہ اور پالیسی کی مالیت اور مدت کے اعتبار مختلف مگر قلسڈ ہوتی ہے۔ مثلاً پاک قطر فیملی تکافل کی کم از کم ۶۵ روپے اور زیادہ سے زیادہ ایک سو دس ماہانہ ہے اس میں سالانہ آٹھ فیصد اضافہ بھی ہوتا ہے۔

۲۔ مینجمنٹ انوسٹمنٹ فیس: پاک قطر فیملی تکافل کمپنی کی تقریباً ڈیڑھ فیصد ہے۔

❁ جنرل تکافل میں مکمل قسط وقف پول میں جمع ہوتی ہے۔ کمپنی وقف کو منظم کرنے اور اس کے سرمایہ سے کاروبار کرنے کی علیحدہ علیحدہ فیس لیتی ہے۔

❁ ہر تکافل کمپنی کا ایک دوسری کمپنی جس کو ری تکافل کہا جاتا ہے سے معاہدہ ہوتا ہے تکافل کمپنی پالیسی ہولڈر کی قسط کا کچھ حصہ ری تکافل کمپنی کو بھی دیتی ہے۔

جو حصہ وقف پول میں جمع ہوتا ہے وہ پالیسی ہولڈرز کی ملکیت سے نکل کر وقف کی ملکیت میں چلا جاتا ہے تاہم تجارتی تکافل کے حامیوں کے مطابق وہ خود وقف نہیں ہوگا صرف وقف کی ملکیت ہوگا جو وقف کے مصالح اور ان لوگوں پر خرچ ہوگا وقف کی مد میں شامل ہونگے۔ ملاحظہ ہو مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کا مقالہ ”تأصيل التأمين التكافلي

على أساس الوقف و الحاجة الداعية اليه“ ص: ۱۸-۲۰

کمپنی ان دونوں کھاتوں میں جمع شدہ رقم سے پالیسی ہولڈرز اور وقف پول کے ایجنٹ کی حیثیت سے کاروبار کرتی ہے جو نفع ہو وہ وقف پول اور پالیسی ہولڈرز کے کھاتے میں جمع کر دیا جاتا ہے۔ وقف پول کا مکمل نفع وقف پول میں ہی جاتا ہے۔

کلیمرز کی ادائیگی میں عموماً سرمایہ دارانہ انشورنس کی شرطوں کو ہی ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ اگر کلیمرز زیادہ ہونے کی وجہ سے وقف پول میں رقم کم پڑ جائے تو قانوناً کمپنی اس بات کی پابند ہوتی ہے کہ وہ قرض حسنہ لیکر باقی کلیمرز ادا کرے۔ یہ قرض خود کمپنی ہی وقف پول کو دیتی ہے جو اس نے آئندہ سربلس سے وصول پانا ہوتا ہے۔

اگر پالیسی ہولڈر بیماری یا حادثے کی وجہ سے قسط ادا کرنے کے قابل نہ رہے تو وہ کمپنی ادا کرتی ہے بشرطیکہ شروع میں یہ فیصلہ کر لیا جائے کیونکہ اس کے لیے اضافی رقم ادا کرنا لازم ہوتی ہے۔

مروجہ تکافل کی قسمیں:

اس کی بنیادی قسمیں دو ہیں:

۱۔ فیملی تکافل۔

۲۔ جنرل تکافل۔

فیملی تکافل:

یہ اصطلاح لائف انشورنس کے متبادل استعمال ہوتی ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ پالیسی ہولڈر کی ہر قسط کا کچھ انوسٹمنٹ کھاتے میں جاتا ہے اور کچھ حصہ وقف پول میں۔

یہاں کمپنی دو قسم کی الگ الگ ایجنسی فیس وصول کرتی ہے ایک وقف پول کا منتظم ہونے کی حیثیت سے یہ وقف پول سے لی جاتی ہے اور دوسری پالیسی ہولڈر کا ایجنٹ ہونے کی حیثیت سے یہ پالیسی ہولڈر کے کھاتے سے کاٹی جاتی ہے۔

اب اگر پالیسی ہولڈر متعینہ مدت سے پہلے فوت ہو جائے تو کمپنی اس کے ورثاء کو ایک تو انوسٹمنٹ اکاؤنٹ میں سے پالیسی حاصل کرنے کی ابتداء سے لے کر فوت ہونے تک جمع کرائی گئی رقم مع اس نفع کے جو سرمایہ کاری سے حاصل ہوا ادا کرے گی۔ اور دوسرا فوت ہونے کی وجہ سے پالیسی ہولڈر کے ذمہ جو اقساط رہ گئیں ہیں وہ وقف پول سے ادا کرے گی اور اگر پالیسی ہولڈر متعینہ مدت تک زندہ رہے تو پھر اس کو حسب ذیل فوائد حاصل ہوں گے۔

✽ انوسٹمنٹ کھاتے میں جمع شدہ رقم مع اس نفع کے جو اس دوران سرمایہ کاری سے حاصل ہوا۔

✽ وقف میں دیے گئے عطیہ کے تناسب سے حصہ بشرطیکہ وقف پول میں سرپلس ہو۔ لیکن اگر کوئی شخص مدت مکمل ہونے سے قبل پالیسی سے ٹکنا چاہے تو وہ صرف اپنی انوسٹمنٹ کھاتے میں موجود رقم اور اس سے حاصل ہونے والے نفع کا حق رکھتا ہے وقف پول میں دی گئی رقم پر اس کا کوئی حق نہیں ہوتا۔

جنرل تکافل:

یہ اصطلاح جنرل انشورنس کی جگہ بولی جاتی ہے۔ یعنی ممکنہ خطرات سے تحفظ کی پالیسی اس میں قسط کی پوری رقم وقف پول میں جاتی ہے۔ اگر دوران مدت وہ نقصان ہو جائے جس کی تلافی کے لیے پالیسی لی گئی ہے تو ازالہ کر دیا جاتا ہے۔ بصورت دیگر سرمایہ دارانہ نظام انشورنس کی طرح پالیسی ہولڈر کو کچھ نہیں ملتا۔ البتہ کمپنی اپنی صوابدید پر کچھ بونس دے سکتی ہے۔ کیا مر وجہ تکافل سود اور غرر سے پاک ہے؟

سکرشل انشورنس کو جن خرابیوں کی بنیاد پر حرام قرار دیا گیا ہے ان میں سر فہرست سود اور غرر (Uncertainty) ہے بادی النظر میں یہ دونوں خرابیاں یہاں بھی پائی جاتیں

ہیں۔ وہ یوں کہ اگر پالیسی ہولڈر مدت پوری ہونے سے پہلے فوت ہو جائے تو اس کو پالیسی کے تحت طے شدہ رقم دی جاتی ہے، جس کا ایک حصہ اس نے ادا ہی نہیں کیا ہوتا۔ اور کمپنی قانونی طور پر اس کی پابند بھی ہوتی ہے۔ جبکہ غرر اس طرح کے دونوں احتمال ہیں ممکن ہے جس نقصان کے ازالہ کے لیے پالیسی لی گئی ہے وہ پیش نہ آئے اور ادا کی ہوئی رقم رائیگاں جائے اور یہ بھی احتمال ہے کہ وہ پیش آجائے اور کمپنی کے ذمہ ادائیگی لازم ہو جائے۔

کیا یہ عقد معاوضہ نہیں؟

تجارتی تکافل کے حامی کہتے ہیں کہ اضافہ اور غرر تب ممنوع ہے جب عقد معاوضہ (لین دین کی وہ صورت جس میں ایک فریق دوسرے سے معاوضہ لینے کا حق رکھتا ہے) میں ہو جبکہ یہ عقد تَبَرُّع (Donation) ہے۔ لیکن یہ توجیہ درست نہیں۔ کیونکہ پالیسی ہولڈر کو حاصل ہونے والے فوائد کا انحصار پالیسی مالیت کی کمی پیشی پر ہوتا ہے یعنی پرمیئم کم تو فائدہ بھی کم پرمیئم زیادہ تو فائدہ بھی زیادہ ہوتا ہے اور یہ سب کچھ باقاعدہ ایک معاہدے کے تحت ہوتا ہے جس کی پابندی فریقین کے لیے لازمی ہوتی ہے اور اس کو قانونی تحفظ بھی حاصل ہے حتیٰ کہ اگر کلیمز کی ادائیگی کے لیے رقم موجود نہ ہو تو (نام نہاد) وقف قرض لے کر یہ ادائیگی ممکن بناتا ہے ایسی صورت میں اس کو عقد تبرع قرار دینا ناقابل فہم ہے۔ نیز اس پر تبرع کی تعریف بھی صادق نہیں آتی کیونکہ تبرع کا معنی ہے کسی کو کوئی چیز اس طرح دی جائے کہ معاوضہ کی خواہش نہ رکھی جائے جبکہ یہاں تو محرک ہی یہ ہے کہ مجھے اس کے عوض یہ فوائد حاصل ہونگے۔

ایک تاویل کا جواب:

مروجہ تکافل کے بعض حامی اس کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ پالیسی ہولڈر یہ فوائد دیئے گئے عطیات کی بنیاد پر نہیں بلکہ وقف کے قواعد و ضوابط کے تحت حاصل کرتا ہے یعنی وہ یہ نہیں کہتا چونکہ میں نے وقف کو اتنا چندہ دیا ہے اس لیے میں ان فوائد کا حق رکھتا ہوں بلکہ وہ یہ کہتا

ہے کہ ان قواعد کی بنیاد پر مجھے یہ فوائد حاصل ہونے چاہئیں۔ یہ قانونی حق اس کو عقد معاوضہ میں داخل نہیں کرتا۔

مگر دو وجوہ کے باعث یہ تاویل بیت عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ہے:

۱۔ ایک تو اس لیے کہ پالیسی ہولڈر کو قواعد و ضوابط کے تحت دعویٰ کرنے کا حق بھی تو دی گئی رقم کے بدلے ہی حاصل ہوا ہے اب آپ قواعد و ضوابط کا نام لیں یا پریمیم کی کمی بیشی کا اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

۲۔ دوسرا اس لیے کہ پالیسی ہولڈر کی نظر تو ان فوائد پر ہوتی ہے جو اس کو مستقبل میں اس کے بدلہ میں حاصل ہونا ہوتے ہیں وہ قواعد و ضوابط کے تحت حاصل ہوں یا دی گئی رقم کے عوض اس کو اس سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے لوگوں کی اکثریت پالیسی حاصل کرتے وقت فوائد کے متعلق تو پوچھتی ہے مگر وقف کے قواعد و ضوابط کے بارہ میں سوال نہیں کرتی۔ ایک مجلس میں جب راقم نے ایک مشہور تکافل کمپنی کے سنیر کنسلٹنٹ سے پوچھا کیا آپ پالیسی حاصل کرنے کے خواہش مندوں کو قواعد و ضوابط سے آگاہ کرتے ہیں تو انہوں صاف کہا کہ لوگ ہم سے صرف یہ پوچھتے ہیں کہ ہمیں کیا ملے گا قواعد و ضوابط کے متعلق کبھی سوال نہیں ہوا۔

اس سے ثابت ہوا کہ جن خرابیوں کی بنا پر روائتی انشورنس حرام ہیں تکافل ان سے پاک نہیں۔

کیا نقدی کو وقف کیا جاسکتا ہے؟

یہاں یہ بحث بھی بڑی اہم ہے کہ روپیہ پیسہ وقف کیا جاسکتا ہے یا نہیں کیونکہ تکافل کمپنی کی پوری عمارت اس پر استوار ہے، لہذا ہم اس مسئلہ کو قدرے تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

اکثر فقہاء اور اہل علم کی رائے میں روپے پیسے اور درہم و دینار کا وقف ہی درست و جائز نہیں۔ چنانچہ فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ کی شرح فتح القدیر میں ہے:

((وَقَالَ الشَّافِعِيُّ رَحِمَهُ اللَّهُ كُلُّ مَا أُمِنَ الْإِنْتِفَاعُ بِهِ مَعَ بَقَاءِ أَصْلِهِ وَيَحْزُوزُ بَيْعُهُ يَحْزُوزُ وَقَفُّهُ، وَهَذَا قَوْلُ مَالِكٍ وَأَحْمَدُ أَيْضًا وَأَمَّا وَقْفُ مَا لَا يُنْتَفَعُ بِهِ إِلَّا بِالْإِتْلَافِ كَالذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْمَأْكُولِ وَالْمَشْرُوبِ فَغَيْرُ جَائِزٍ فِي قَوْلِ عَامَّةِ الْفُقَهَاءِ، وَالْمُرَادُ بِالذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ الدَّرَاهِمُ وَالْذَّنَانِيرُ وَمَا لَيْسَ بِحُلِيِّ))

”امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا ہے: کہ ہر وہ چیز جس کو باقی رکھ کر اس سے فائدہ حاصل کرنا ممکن ہو اور اس کی بیع بھی جائز ہو تو اس کا وقف درست ہے یہ امام مالک اور امام احمد کا بھی قول ہے۔ باقی اس چیز کا وقف جس کو صرف کیے بغیر اس سے استفادہ ممکن نہ ہو جیسے سونا، چاندی اور کھانے پینے کی اشیاء ہیں تو عام فقہاء کے نقطہ نظر میں یہ جائز نہیں ہے۔ سونے اور چاندی سے مراد درہم، دینار اور وہ سونا ہے جو یور کی شکل میں نہ ہو۔“

شارح بخاری علامہ ابن بطال رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

((قال ابو حنيفة وابو يوسف لا يجوز وقف الحيوان والعروض والذنانير والدراهم)) [شرح صحيح البخاری: ج ۸ ص ۱۹۸]

”امام ابو حنیفہ اور ابو یوسف رحمہم اللہ کا قول ہے کہ جانور، سامان اور درہم و دینار کا وقف جائز نہیں۔“

مشہور حنفی عالم علامہ انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

((واعلم أن وقف المنقول لا يصح على أصل المذهب واجازه محمد فيما تعارفه الناس)) [فيض الباری ج ۳ ص ۴۱۶]

”جان لو اصل (حنفی) مذہب میں اشیاء منقولہ کا وقف صحیح نہیں ہے۔ مگر امام محمد رحمہ اللہ نے ان چیزوں میں اس کی اجازت دی ہے جن میں لوگوں کا عرف ہو جائے۔“

علامہ ابن قدامہ حنبلی رحمہ اللہ قطر از ہیں:

((وَجُمِلَتْهُ أَمْ لَا لَا يُمَكِّنُ الْإِنْتِفَاعُ بِهِ مَعَ بَقَاءِ عَيْنِهِ، كَالذَّنَانِيرِ وَالذَّرَاهِمِ، وَالْمَطْعُومِ وَالْمَشْرُوبِ، وَالشَّمْعِ، وَأَشْبَاهِهِ، لَا يَصِحُّ

وَقَفُّهُ، فِي قَوْلِ عَامَّةِ الْفُقَهَاءِ وَأَهْلِ الْعِلْمِ، إِلَّا شَيْئًا يُحْكِي عَنْ مَالِكَ، وَالْأَوْزَاعِيِّ، فِي وَقْفِ الطَّعَامِ، أَنَّهُ يَجُوزُ وَلَمْ يَحْكِهِ أَصْحَابُ مَالِكٍ وَلَيْسَ بِصَحِيحٍ؛ لِأَنَّ الْوَقْفَ تَحْبِيسُ الْأَصْلِ وَتَسْيِيلُ الثَّمَرَةِ، وَمَا لَا يُنْتَفَعُ بِهِ إِلَّا بِالِاتِّلَافِ لَا يَصِحُّ فِيهِ ذَلِكَ))

[المغنی ج ۸ ص: ۲۲۹]

”اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس چیز کو باقی رکھ کر اس فائدہ اٹھانا ممکن نہ ہو جیسے درہم و دینار، کھانا، مشروب، شمع اور اس جیسی دوسری اشیاء عام فقہاء اور اہل علم کے نزدیک ان کا وقف درست نہیں ہے۔ البتہ امام مالک اور امام اوزاعی رحمہم اللہ سے کھانے کے وقف کے متعلق مروی ہے کہ یہ جائز ہے (اس کو امام مالک کے شاگردوں نے بیان نہیں کیا) لیکن یہ درست نہیں کیونکہ وقف کا مطلب ہے ”اصل کو باقی رکھنا اور اس کے فائدہ کو اللہ کی راہ میں خیرات کرنا“ اور جس کو تلف کیے بغیر اس سے فائدہ لینا ممکن نہ ہو اس میں وقف صحیح نہیں ہوتا۔“

مزید لکھتے ہیں:

((وَجُمْلَةُ ذَلِكَ أَنَّ الَّذِي يَجُوزُ وَقْفُهُ، مَا جَازَ بَيْعُهُ، وَجَازَ الْإِنْتِفَاعُ بِهِ مَعَ بَقَاءِ عَيْنِهِ، وَكَانَ أَصْلًا يُفْقَى بَقَاءً مُتَّصِلًا، كَالْعَقَارِ وَالْحَيَوَانَاتِ، وَالسَّلَاحِ، وَالْأَنْثَاثِ، وَأَشْبَاهِ ذَلِكَ))

[المغنی ج ۸ ص: ۲۳۱]

”وقف اس کا جائز ہے جس کی بیع اور اس کو بعینہ باقی رکھ کر اس سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ اور وہ ایسی چیز ہو جو متصل باقی رہے جیسے زمین، جانور، اسلحہ، اثاثہ اور اس قسم کی دوسری اشیاء ہیں“

علما و فقہاء کا موقف تو آپ اوپر ملاحظہ کر چکے ہیں، البتہ بعض اہل علم وہ بھی ہیں جو رقم کو بھی وقف کرنا جائز سمجھتے ہیں۔ ان میں امام بخاری رحمہم اللہ بھی شامل ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اس کے حق میں عنوان بھی قائم کیا ہے۔

((بَابُ وَقْفِ الدَّوَابِّ وَالْكُرَاعِ وَالْعُرُوضِ وَالصَّامِتِ))

[صحیح البخاری، کتاب الوصایا]

”جانوروں، گھوڑوں، سامان اور سونے، چاندی کے وقف کا بیان۔“

اپنے موقف پر استدلال کے لیے انہوں نے اس باب کے تحت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ نقل کیا ہے:

((أَنَّ عُمَرَ حَمَلَ عَلَى فَرَسٍ لَهُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَعْطَاهَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِيَحْمِلَ عَلَيْهَا رَجُلًا، فَأُخِيرَ عُمَرُ أَنَّهُ قَدْ وَقَفَهَا يَبِيعُهَا، فَسَأَلَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يَبْتَا عَنْهَا فَقَالَ لَا تَبْتَعْهَا، وَلَا تَرْجِعَنَّ فِي صَدَقَتِكَ)) [ايضاً]

”حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا گھوڑا اللہ کی راہ میں دیا آپ نے وہ گھوڑا رسول اللہ کو دیا تاکہ کسی آدمی کو سواری کے لیے دے دیں۔ حضرت عمر کو اطلاع ملی کہ وہ شخص اس کو فروخت کر رہا ہے انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ وہ اسے خرید لیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا اس کو مت خریدیں اور اپنا صدقہ واپس نہ لیں۔“

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنے موقف کی تائید میں امام زہری رحمہ اللہ کا یہ اثر بھی ذکر کیا ہے:

((قَالَ الزُّهْرِيُّ فِيمَنْ جَعَلَ أَلْفَ دِينَارٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ، وَدَفَعَهَا إِلَى غُلَامٍ لَهُ تَاجِرٌ يَتَجَرُّ بِهَا، وَجَعَلَ رِبْحَهُ صَدَقَةً لِلْمَسَاكِينِ وَالْأَقْرَبِينَ، هَلْ لِلرَّجُلِ أَنْ يَأْكُلَ مِنْ رِبْحِ ذَلِكَ أَلْفِ شَيْئًا، وَإِنْ لَمْ يَكُنْ جَعَلَ رِبْحَهَا صَدَقَةً فِي الْمَسَاكِينِ قَالَ لَيْسَ لَهُ أَنْ يَأْكُلَ مِنْهَا)) [صحیح بخاری:

کتاب الوصایا باب وقف الدواب والکراع والعروض والصامت]

”امام زہری نے اس شخص کے متعلق فرمایا جس نے ہزار دینار اللہ کی راہ میں دیے اور وہ اپنے تاجر غلام کو حوالے کر دیے کہ وہ ان سے تجارت کرے اور اس کا نفع مساکین اور رشتہ داروں کے لیے صدقہ کر دیا کیا وہ شخص اس ہزار کے نفع سے خود کھا سکتا ہے؟

خصوصاً اگر اس کا نفع مساکین کے لیے صدقہ نہ کیا ہو: امام زہری نے فرمایا اس کو (کسی صورت) یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس سے کھائے۔“

صحیح موقوف:

امام بخاری رحمہ اللہ کا تَفَقُّہ فی الدین اور مقام و مرتبہ شک و شبہ سے بالاتر ہے لیکن اگر فریقین کے پیش کردہ دلائل کا باہم تقابل کیا جائے تو حسب ذیل وجوہ کے باعث ان حضرات کا موقف صائب معلوم ہوتا ہے جو روپے پیسے کے وقف کو جائز نہیں سمجھتے۔

تمام فقہاء اس پر متفق ہیں کہ وقف میں اصل چیز کو باقی رکھ کر صرف اس کی منفعت خرچ کی جائے گی۔ اس کی بنیاد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے:

((إِنِّي شَفَعْتُ حَبَسْتُ أَصْلَهَا، وَتَصَدَّقْتُ بِهَا)) [صحیح بخاری: کتاب

الوصایا، باب الوقف کیف یکتب]

”اگر تو چاہے تو اس کا اصل روک لے اور اسکی منفعت (پیداوار) کو صدقہ کر دے۔“

یہ حدیث اس امر کی صریح دلیل ہے کہ وقف وہ چیز ہو سکتی ہے جس کو باقی رکھ کر فائدہ اٹھانا ممکن ہو جبکہ روپیہ اپنی اصل حیثیت میں رہتے ہوئے کوئی فائدہ دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا، نہ اس کو کھایا جاسکتا ہے، نہ پہنا جاسکتا ہے، نہ اس میں رہائش رکھی جاسکتی ہے اور نہ ہی اس پر سواری کی جاسکتی ہے یہ تو حصول اشیاء کا ایک وسیلہ ہے یعنی جب تک اس کو خرچ نہ کریں اس سے استفادہ ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ روپے، پیسے کو کرایہ پر دینا درست نہیں کیونکہ کرایہ اسی چیز کا لیا جاسکتا ہے جسے صرف کے بغیر استعمال کیا جاسکتا ہو جبکہ نقد میں یہ خوبی نہیں اس لیے اس کا کرایہ لینا جائز نہیں ہے۔ اسی بنا پر امام نووی اور علامہ ابن قدامہ رحمہما اللہ نے درہم و دینار کے وقف کا جواز ان لوگوں کا مسلک بیان کیا ہے جو ان کا کرایہ لینا جائز سمجھتے ہیں ملاحظہ ہو: ”روضة الطالبین ۲/۲۵۴ المغنی ۸/۲۲۹“

جب رائج مسلک کے مطابق ان کا کرایہ درست نہیں ہے مروجہ تکافل کے حامی بھی اس سے متفق ہیں اور وجہ بھی وہی بیان کرتے ہیں جو فقہائے کرام نے وقف کے عدم جواز

میں کی ہے کہ نقد کو استعمال کیے بغیر فائدہ اٹھانا ممکن نہیں۔ دیکھیے: ”اسلامی بینکاری کی بنیادیں“ ص: ۱۶۹ از مولانا تقی عثمانی۔“

جب موجودہ تکافل کے مؤیدین بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ روپیہ پیسہ ایسی چیز نہیں جس کو باقی رکھ کر مستفید ہوا جاسکے تو پھر فقہاء کرام کی اس شرط کہ ”وقف وہی چیز ہو سکتی ہے جو باقی رہ کر قابل فائدہ ہو“ کو نظر انداز کر کے نقد کے وقف کے جواز کا فتویٰ سمجھ سے بالاتر ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ:

جو حضرات نقد کے وقف کے قائل ہیں ان کے خیال میں روپے پیسے کو بھی باقی رکھ کر فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے وہ یوں کہ اس سے کاروبار کیا جائے جو نفع ہو وہ خرچ کر دیا جائے۔ مگر یہ دو وجہ سے درست نہیں ہے۔

✽ ایک تو اس لیے کہ یہ صورت روپے پیسے کو اسکی اصل حیثیت میں باقی رکھ کر فائدہ حاصل کرنے کی نہیں اس طرح کا فائدہ تو روپے پیسے کو کرایہ پر بھی لے کر لیا جاسکتا ہے لیکن اس کے باوجود یہ شرعاً جائز نہیں کیوں؟ اس لیے کہ اس قسم کا فائدہ نقد کی تخلیق کا اصل مقصد نہیں ہے جیسا کہ علامہ ابن قدامہ حنبلی رحمہ اللہ نے المغنی میں لکھا ہے

✽ دوسرا اس لیے کہ روپے پیسے کو کاروبار میں لگانے سے فائدہ کی بجائے نقصان کا بھی اندیشہ ہے اور ممکن ہے وقف ختم ہی ہو جائے اس لیے یہ کہنا کہ وقف کی ہوئی رقم سے کاروبار کر کے اس کا نفع خرچ کیا جائے گا آپ ﷺ کے اس ارشاد کہ ”اصل روک کر رکھو اور اس کی پیداوار خرچ کرو“ کے خلاف ہے۔

۲۔ جو حضرات نقد کے وقف کو ناجائز کہتے ہیں ان کا موقف درست ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قائلین نے اپنی تائید میں جو دلائل ذکر کے ہیں وہ ثبوت کے لیے نا کافی ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے ایسی منقولی اشیاء کا وقف تو ثابت ہوتا ہے جن کا اپنا ذاتی استعمال ہو مثلاً گھوڑا اس کا اپنا ذاتی استعمال ہے وہ ہے سواری وغیرہ لیکن نقد جس کا اپنا کوئی ذاتی استعمال نہیں کا وقف ثابت نہیں ہوتا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے نقد کو گھوڑے پر

قیاس کیا ہے جو درست نہیں کیونکہ دونوں میں واضح فرق ہے۔

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ بعض اہل علم کی رائے میں یہ وقف تھا ہی نہیں بلکہ صدقہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے تو فرمایا کہ اپنا صدقہ مت خریدو مگر بیچنے والے پر پابندی نہیں لگائی۔ اور نہ ہی حضرت عمر نے اس پر کوئی اعتراض کیا اگر یہ وقف ہوتا تو نبی ﷺ اس کو بھی منع فرما دیتے کیونکہ وقف کو فروخت کرنا جائز نہیں۔

۳۔ امام زہری رحمہ اللہ کا اثر بھی دلیل نہیں بن سکتا کیونکہ یہ وقف کے بارہ میں نہیں بلکہ عام صدقہ کے متعلق ہے اس کا قرینہ یہ ہے کہ ان سے پوچھا گیا کیا وہ شخص اس کے نفع سے خود بھی کھا سکتا ہے انہوں نے جواب دیا نہیں۔ اگر یہ وقف ہوتا تو یہ پابندی نہ لگاتے کیونکہ وقف کنندہ کو شرعاً اپنے وقف سے فائدہ اٹھانے کی اجازت ہے۔

محدث اسماعیلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں زہری رحمہ اللہ کا اثر اس وقف کے خلاف ہے جس کی اجازت نبی ﷺ نے حضرت عمر کو دی تھی کہ ”اصل کو روکے رکھو اور شرعاً خرچ کرو“ سونے چاندی سے تو تب ہی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے جب اس کو بعینہ کسی دوسری چیز کی طرف نکالا جائے یہ اصل کو روکے رکھو اور شرعاً خرچ کرو کی صورت نہیں بنتی۔ [فتح الباری ج ۵ ص ۴۹۵]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے محدث اسماعیلی کے اعتراض کا جو جواب دیا ہے وہ صرف زیور جس کا ذاتی استعمال واضح ہے پر منطبق ہوتا ہے درہم و دینار پر نہیں اس لیے اس کو روپے پیسے کے وقف کی دلیل نہیں بنایا جاسکتا۔

موجودہ تکفل کے حامی فتح القدیر کے حوالے سے امام زفر رحمہ اللہ کے شاگرد محمد بن عبد اللہ انصاری رحمہ اللہ کے فتویٰ کا ذکر بھی بڑی شد و مد سے کرتے ہیں کہ انہوں نے درہم و دینار کے وقف کو جائز قرار دیا ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ فتویٰ خود تکفل کمپنیوں کی خلاف جاتا ہے کیونکہ اس میں یہ الفاظ بھی ہیں:

((قِيلَ وَكَيْفَ؟ قَالَ يَذْفَعُ الدَّرَاهِمَ مُضَارَبَةً ثُمَّ يَتَصَدَّقُ بِهَا فِي
الْوَجْهِ الَّذِي وَقَفَ عَلَيْهِ)) [فتح القدیر]

”یہ کیسے ممکن ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ وہ دراہم مضاربہ کی بنیاد پر کاروبار کے

لیے دے پھر ان پر صدقہ کرے جن پر وقف کیا گیا ہے۔“

جبکہ تکافل کمپنیوں کے مالکان اپنے قائم کیے ہوئے وقف سے کسی کو بطور مضاربہ رقم نہیں دیتے بلکہ خود ہی کاروبار کرتے ہیں اور اس کی باقاعدہ فیس وصول کرتے ہیں۔ امام زہری رحمہ اللہ کے اثر میں بھی یہی ہے کہ اس نے غلام تاجر کو دیے تھے نہ کہ خود ہی تجارت میں لگا کر اس کے عوض فیس لینا شروع کر دی۔

اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ جو حضرات نقد کے وقف کے قائل ہیں ان کا نقطہ نظر کمزور ہے۔ لہذا تکافل کمپنیوں کی بنیاد ہی ایسے پر موقف استوار ہے جو دلائل کی قوت سے محروم ہے۔

فائدہ: یہاں یہ وضاحت کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ تکافل کے حامیوں کی رائے میں پالیسی ہولڈرز کی اقساط سے جو حصہ وقف پول میں جاتا ہے وہ وقف کی بجائے وقف کی ملکیت ہوتا ہے جو وقف کے مصالح کے علاوہ ان لوگوں پر خرچ ہوگا جن کے لیے وقف قائم کیا گیا ہوگا جیسا کہ ہم پیچھے بیان کر آئے ہیں سوڈان کے معروف عالم پروفیسر صدیق محمد امین ضریر کے نزدیک اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

((والمالم یأت الباحث بدلیل علی أن ما یتبرع للوقف یرصرف

للموقوف علیہم فان تأصیل التأمین التكافلی علی أساس الوقف

ینہار من أساسه)) [تعقیب عن بحث تأصیل التأمین التكافلی

علی أساس الوقف والحاجة الداعية الیه]

”جب تک محقق (مولانا تقی عثمانی) صاحب اس بات کی دلیل پیش نہیں کرتے کہ جو

عطیہ وقف کو دیا جاتا ہے وہ ان لوگوں پر خرچ کیا جاسکتا ہے جن پر وقف کیا گیا ہو تو

وقف کی بنیاد پر تکافلی انشورنس کا اصول اپنی بنیاد سے اکھڑ جاتا ہے۔“

فائدہ: یہاں اس امر کا تذکرہ خالی از وچہی نہ ہوگا کہ دنیا میں مروجہ تکافل کی سب سے

پہلی کمپنی سوڈان میں ۱۹۷۹ء میں صدیق محمد امین زیر نگرانی قائم ہوئی تھی لیکن اس کی بنیاد وقف کی بجائے تجارت پر تھی۔ مگر اس کو وقف کی بنیاد پر قائم تکافل کمپنیوں کے مفتیان کرام جائز نہیں سمجھتے۔

بعض تحقیق طلب مسائل:

مروجہ اسلامی انشورنس میں ایلوکیشن اور ایڈمن فیس کے نام پر وصولی بھی غور طلب پہلو ہے جیسا کہ ہم گزشتہ صفحات میں بیان کر آئے ہیں کہ پہلے سال قسط کی ستاسی (یہ زیادہ سے زیادہ ہے) دوسرے سال بیس جبکہ تیسرے سال دس فیصد رقم ایلوکیشن فیس کے نام پر کاٹ لی جاتی ہے یہ ساری رقم کنسلٹنٹ جو کسٹمر گھیر کر لاتا ہے اور برانچ ذمہ داران کی جیبوں میں جاتی ہے۔ پالیسی ہولڈر کو اس کا علم نہیں ہوتا۔ یہ بالکل وہی طریقہ ہے جو روایتی انشورنس کا ہے کہ پہلی قسط کا معتد بہ حصہ انشورنس کمپنی کے ایجنٹ کو دے دیا جاتا ہے۔ جب نام نہاد اسلامی انشورنس نظریاتی مرحلہ میں تھی تب یہ کہا جاتا تھا کہ روایتی انشورنس میں یہ ظلم ہوتا ہے کہ پہلی قسط تقریباً پوری کی پوری ایجنٹ کی جیب میں چلی جاتی ہے جبکہ تکافل میں یہ نہیں ہوتا۔ لیکن جب عملی مرحلہ آیا تو نام نہاد اسلامی انشورنس نے بھی وہی راستہ اختیار کیا۔ ہمارے خیال میں یہ پالیسی ہولڈر کے ساتھ زیادتی ہے وہ اس طرح کہ اگر وہ ایک قسط ادا کرنے کے بعد تکافل کمپنی کو الوداع کہتا ہے تو قواعد و ضوابط کے مطابق اس کو صرف وہ رقم ملتی ہے جو انوسٹمنٹ کھاتے میں جمع ہو یا پھر اس سے حاصل ہونے والا نفع۔ اب ستاسی فیصد تو ایلوکیشن فیس کے نام پر پہلے ہی الگ کیا جا چکا ہے باقی تیرہ فیصد بچا اس میں سے آدھا وقف میں چلا گیا جو شرعاً واپس نہیں لیا جاسکتا۔ جو باقی رہ گیا اس میں سے ڈیڑھ فیصد مینجمنٹ اور ۶۵ سے لیکر ایک سو دس روپے تک ماہانہ ایڈمن فیس بھی لی جاتی ہے۔ پالیسی ہولڈر کے ہاتھ کیا آیا؟ تکافل کمپنی کے تنخواہ دار شریعہ بورڈ کے مفتیان کرام کا ایک عدد فتویٰ اور اس کے نتیجے میں اسلام کے نظام تکافل کے متعلق پیدا ہونے والی بدگمانی کہ یہ بھی استحصال پر مبنی نظام ہے۔ (اعدا ذلہ منہ) ایلوکیشن فیس کی اس کے علاوہ کوئی وجہ نہیں کی

جاسکتی کہ یہ باطل حربوں سے مال کھانے کی بدترین شکل ہے۔

ایک غیر معقول استدلال:

مروجہ تکافل کے حامی بڑی سادگی سے کہتے ہیں کہ ہم ہر بات پہلے بتا دیتے ہیں۔ ناجائز تو تب ہو جب کوئی باث خفیہ رکھی جائے۔ یہ انتہائی لغو قسم کا استدلال ہے۔ کیا بتا کر باطل طریقے سے کسی کا مال ہڑپ کرنا جائز ہو جاتا ہے؟ ناجائز کاروبار میں ملوث لوگوں کی اکثریت بھی یہی کہتی ہے کہ ہم ہر بات پہلے طے کرتے ہیں، پھر یہ ناجائز کیسے؟ کیا تکافل کے حامی اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ اسلام نے بعض معاملات محض اس لیے ناجائز قرار دیے ہیں کہ ان سے کسی ایک فریق کو نقصان پہنچ رہا ہوتا ہے۔

خلاصہ

مذکورہ بالا تفصیل کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

- ❁ مروجہ تکافل شرعی تکافل سے بالکل مختلف ہے۔
- ❁ روایتی انشورنس کی طرح رائج الوقت تکافل بھی سود اور غرر پر مشتمل ہے۔
- ❁ تکافل پالیسی عقد معاوضہ ہے نہ کہ عقد تبرع جیسا کہ تکافل کے حامی باور کراتے ہیں۔
- ❁ رائج نقطہ نظر کے مطابق نقدی کو وقف نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا تکافل کمپنیوں کی بنیاد ہی غلط ہے۔
- ❁ ایلویشن فیس باطل طریقہ سے مال ہڑپ کرنے میں داخل ہے۔



قرض کے مسائل

قرض لینا پسندیدہ نہیں:

قرض چونکہ ”رات کی پریشانی اور دن کی ذلت ہے“ اس لیے شریعت اسلامیہ عام حالات میں قرض لینے کو پسند نہیں کرتی۔ نبی ﷺ خود بھی قرض سے پناہ مانگتے اور اپنے ساتھیوں کو بھی اس سے بچنے کی تلقین فرماتے۔ ذیل میں اس سلسلے کی بعض روایات ملاحظہ فرمائیں:

((أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَ يَدْعُو فِي الصَّلَاةِ وَيَقُولُ اللَّهُمَّ إِنِّي أَعْمَدُ بِكَ مِنَ الْمَأْتِمِ وَالْمَغْرَمِ فَقَالَ لَهُ قَائِلٌ مَا أَكْثَرَ مَا تَسْتَعِيدُ يَا رَسُولَ اللَّهِ مِنَ الْمَغْرَمِ قَالَ إِنَّ الرَّجُلَ إِذَا غَرِمَ حَدَّثَ فَكَذَّبَ وَوَعَدَ فَأَخْلَفَ)) [صحیح البخاری، باب من استعاذ من الدين]

”بلاشبہ رسول اللہ ﷺ نماز میں یہ دعا کیا کرتے تھے اے اللہ میں گناہ اور قرض سے آپ کی پناہ طلب کرتا ہوں۔ ایک کہنے والے نے آپ سے عرض کیا اے اللہ کے رسول آپ قرض سے کس قدر زیادہ پناہ مانگتے ہیں۔ آپ نے فرمایا بلاشبہ انسان جب مقروض ہوتا ہے بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے اور وعدہ کرتا ہے تو خلاف ورزی کرتا ہے۔“

((لَا تُخَيِّفُوا أَنْفُسَكُمْ أَوْ قَالَ الْأَنْفُسَ فَقِيلَ لَهُ يَا رَسُولَ اللَّهِ وَمَا نُخَيِّفُ أَنْفُسَنَا قَالَ الدَّيْنُ)) [مسند احمد، حلیث عقبہ بن عامر الجہنی]

”اپنی جانوں کو خوف میں مبتلا نہ کرو آپ سے کہا گیا اے اللہ کے رسول ہم کیسے اپنی جانوں کو خوف میں مبتلا کرتے ہیں فرمایا قرض کے ساتھ۔“

پہلی حدیث سے یہ پتہ چلتا ہے کہ قرض مقروض کو جھوٹ اور وعدہ کی خلاف ورزی تک

پہنچا دیتا ہے جبکہ دوسری حدیث یہ بتا رہی ہے کہ قرض لینے والے انسان کا امن و سکون ختم ہو جاتا ہے۔

معقول عذر کی بنا پر قرض لینے کی اجازت ہے:

تاہم ناگزیر حالات میں قرض لینے کی گنجائش رکھی گئی ہے بشرطیکہ مستقبل میں ادائیگی کا امکان اور پختہ ارادہ ہو۔ ذخیرہ حدیث میں اس کی کافی مثالیں موجود ہیں۔ یہاں صرف ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے۔ عبد اللہ بن ابی ربیعہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

((اَسْتَقْرَضَ مِنِّي النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَرْبَعِينَ أَلْفًا فَجَاءَهُ مَالٌ فَدَفَعَهُ إِلَيَّ وَقَالَ بَارَكَ اللَّهُ لَكَ فِي أَهْلِكَ وَمَالِكَ إِنَّمَا جَزَاءُ السَّلَفِ الْحَمْدُ وَالْأَذَاءُ)) [سنن النسائي، باب الاستقراض]

”نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے چالیس ہزار قرض لیے آپ کے پاس مال آیا تو آپ نے مجھے لوٹا دیے اور فرمایا اللہ تیرے اہل اور مال میں برکت پیدا فرمائے قرض کا بدلہ تو شکریہ ادا کرنا اور (قرض کی) ادائیگی ہے۔“

ذاتی ضرورت کے علاوہ اجتماعی اور ملکی ضرورت کے لیے بھی قرضہ لیا جاسکتا ہے۔

قرض معاف نہیں ہوگا:

شریعت کی نگاہ میں قرض کی عدم ادائیگی ناقابل معافی گناہ ہے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

((يُغْفَرُ لِلشَّهِيدِ كُلُّ ذَنْبٍ إِلَّا الدَّيْنَ)) [صحیح مسلم، باب من قتل فی سبیل اللہ]

”شہید کا قرض کے علاوہ ہر گناہ معاف کر دیا جاتا ہے۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاحب استطاعت مقرض کی طرف سے قرض کی ادائیگی میں ٹال مٹول کو بھی ظلم قرار دیا ہے۔ ہاں اگر مقرض تنگ دست ہو تو قرآنی حکم کے مطابق اس کو



فراخ دتی تک مہلت ملتی چاہیے۔

قرض کے بدلے فائدہ اٹھانا:

قرض کی وجہ سے حاصل ہونے والا ہر فائدہ سود ہے۔ ہم پیچھے حضرت ابی بن کعب، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کے حوالے سے بیان کر آئے ہیں کہ:

((انہم نہوا عن قرض جرّ منفعة)) [ارواء الغلیل: ۵/۲۳۴]

”انہوں نے اس قرض سے منع کیا جو فائدے کا باعث بن رہا ہو۔“

بلکہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ تو مقروض کی طرف سے دیے گئے ہدیہ کو بھی سود قرار دیتے تھے۔ چنانچہ ان کا یہ فتویٰ صحیح بخاری میں بایں الفاظ نقل ہوا ہے:

((اذا كان لك على رجل حق فاهدي اليك حمل تبن او حمل

شعير او حمل قت فلا تاخذه فانه ربا)) [صحیح بخاری، کتاب

المناقب، باب مناقب عبداللہ بن سلام]

”جب تمہارا کسی شخص پر کوئی حق ہو اور پھر وہ تمہیں ایک تنکے، جو کے ایک دانے یا ایک

گھاس کے برابر بھی ہدیہ دے تو اسے قبول نہ کرنا، کیونکہ وہ بھی سود ہے۔“

ہاں اگر قرض خواہ اور مقروض کے درمیان پہلے سے ہدیہ کا تبادلہ چلا آ رہا ہو تو پھر اس کی

اجازت ہے۔

نبی ﷺ نے تو قرض دینے کے ساتھ کوئی چیز خریدنے یا بیچنے کی شرط لگانے کی بھی

اجازت نہیں دی۔

((لَا يَحِلُّ سَلَفٌ وَبَيْعٌ)) [سنن الترمذی، باب ما جاء فی کراہیۃ بیع

مالیس عنده]

”قرض اور بیع جائز نہیں۔“

یعنی قرض خواہ کا یہ شرط لگانا کہ میں تب قرض دوں گا جب آپ یہ چیز مجھ سے خریدیں

گے یا اپنی فلاں چیز مجھے پچھیں گے، درست نہیں۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ اگر مقروض ادائیگی کے وقت بغیر شرط کے از خود زیادہ واپس کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ ”حسن القضاء“ یعنی عمدہ طریقے سے ادائیگی کرنے میں شامل ہے اور یہ آپ کی سنت ہے۔ مگر اس کو بطور نظام کے اختیار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ طے شدہ اضافہ ہی شمار ہوگا۔

قرض کی ادائیگی کا معیار:

افراط زر کی وجہ سے کرنسی کی قوت خرید کم ہوتی رہتی ہے اس لیے قرض کی بحث میں یہ سوال انتہائی اہم ہے کہ قرض کی واپسی کس طرح ہوگی نوٹ کے اوپر لکھی ہوئی قیمت کے مطابق یا قوت خرید کے لحاظ سے؟

بعض حضرات کے خیال میں قرض کی ادائیگی سونے سے وابستہ ہونی چاہیے یعنی قرض دیتے وقت یہ سمجھنا چاہیے کہ نوٹوں کی بجائے سونا قرض دیا جا رہا ہے اور قرض دی گئی رقم کے بدلے جتنا سونا اس دن خریدا جا سکتا تھا جس دن قرض دیا گیا تھا واپسی کے وقت اتنا سونا یا اس کی قیمت ادا کی جانی چاہیے۔ لیکن یہ رائے صائب نہیں کیونکہ اس کی بنیاد اس نظریے پر ہے کہ نوٹ کی پشت پر سونا ہے حالانکہ یہ بات طے شدہ ہے اب نوٹ سونے کی نمائندگی نہیں کرتے۔

بعض اہل علم کی رائے میں قرض کی واپسی قیمتوں کے اشاریے سے مربوط ہونی چاہیے اس کا مطلب ہے کہ قرض کی واپسی کے وقت نوٹوں کی اتنی مقدار زیادہ ادا کی جانی چاہیے جو افراط زر کی شرح کے مساوی ہو۔ مثلاً ایک ہزار روپے قرض دیے گئے ادائیگی کی تاریخ تک افراط زر میں بیس فیصد اضافہ ہو گیا تو اب ایک ہزار کی بجائے بارہ سو روپے واپس کیے جائے۔ لیکن یہ نقطہ نظر بھی کمزور ہے ایک تو اس لیے کہ قیمتوں کا اشاریہ تخمینی ہے جبکہ قرض کی ادائیگی میں حقیقی برابری ضروری ہے۔



دوسرا اس لیے کہ شرعی طور پر قرض کی ادائیگی میں قوت خرید کی بجائے مقدار میں برابری کا اعتبار کیا جاتا ہے۔

✽ اس حوالے سے تیسری تجویز یہ پیش کی جاتی ہے کہ قرض کا لین دین روپے کی بجائے ڈالر میں کیا جائے یعنی اگر کسی شخص کو ایک ہزار روپے کی ضرورت ہو تو قرض دینے والا ہزار روپے کی جگہ اتنی مالیت کے ڈالر خرید کر دے اور مقروض بھی ڈالر ہی واپس کرے۔ مگر بوجہ یہ تجویز بھی قابل عمل نہیں۔

✽ افراط زر کا اثر ڈالر پر بھی پڑتا ہے روپے کی نسبت کم سہی مگر پڑتا ضرور ہے۔
 ✽ شہری علاقوں سے دور دیہات اور قصبہ میں بے شمار ایسے لوگ ہیں جن کے لیے منی چینجر تک پہنچنا بھی ایک مسئلہ ہے اس تجویز کے مطابق قرض کا لین دین مشکلات کو دعوت دینے کے مترادف ہوگا۔

✽ اس تجویز کے مطابق قرض خواہ اور مقروض کو دو دو مرتبہ منی چینجر کے پاس جانا پڑے گا ایک مرتبہ ڈالر لینے اور دوسری مرتبہ ڈالر کے بدلے روپے حاصل کرنے کے لیے۔ ظاہر ہے ہر مرتبہ کمیشن بھی دینا پڑے گا جس سے قرض کا لین دین مزید بوجہ بن جائے گا۔
 اس لیے صحیح موقف یہی ہے کہ قرض میں سو کے بدلے سو کا نوٹ ہی واپس کرنا ضروری ہے خواہ اس کی قوت خرید کم ہو چکی ہو۔

ایک اعتراض کا جواب:

بعض حضرات کہتے ہیں یہ تو قرض خواہ پر ظلم ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ قرض دینا مقروض کے ساتھ ہمدردی ہے اسی لیے ہماری شریعت نے دو مرتبہ قرض دینے کو ایک مرتبہ صدقہ کرنے کے برابر قرار دیا ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((مَا مِنْ مُسْلِمٍ يُقْرِضُ مُسْلِمًا قَرْضًا مَرَّتَيْنِ إِلَّا كَانَ كَصَدَقَتِهَا مَرَّةً))

[سنن ابن ماجہ ، باب القرض]

”جو مسلمان کسی مسلمان کو دو مرتبہ قرض دے وہ ایک دفعہ صدقہ کے برابر ہوگا۔“

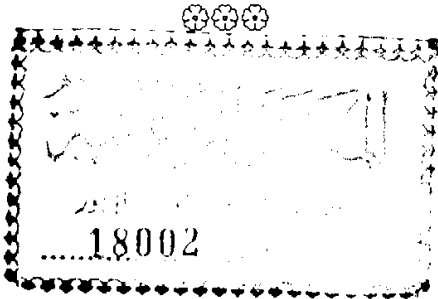
یعنی ایک مرتبہ قرض دینا نصف صدقہ کے مساوی ہے۔

اگر کوئی اس اجر و ثواب پر مطمئن نہیں ہے تو اس کے لیے بہتر ہے کہ وہ قرض نہ دے اسلام اس کو مجبور نہیں کرتا۔ اگر حصول نفع کا ارادہ ہو تو اس کے لیے قرض کی بجائے شرکت و مضاربہ کا اختیار کیا جانا چاہیے۔

مزید برآں افراط زر اجتماعی مسئلہ ہے جس میں مقروض کا کوئی عمل دخل نہیں ہے اس کی تلافی کا ذمہ دار مقروض کو ٹھہرانا زیادتی ہے۔

خلاصہ

- ❁ سوائے انتہائی مجبوری کے قرض لینے سے بچنا چاہیے۔
- ❁ قرض ہر حال میں واپس کرنا چاہیے۔
- ❁ قرض کے عوض فائدہ اٹھانا جائز نہیں۔
- ❁ قرض میں سو (۱۰۰) کے بدلے سو (۱۰۰) کا نوٹ ہی واپس کیا جائے گا۔



ابو ہریرہ شریعہ کا کالج

احباب دانش جانتے ہیں کہ اب تک ملک بھر میں ابو ہریرہ شریعہ کالج واحد ادارہ ہے جس میں لازمی (Comulsary) نصاب کے طور پر بیک وقت درس نظامی اور گریجویشن کروائی جاتی ہے۔ لہذا اپنے بچوں کو ابو ہریرہ کالج میں داخل کروائیں تاکہ وہ دینی و دنیوی علوم سے آراستہ ہو سکیں۔ بفضل اللہ تعالیٰ یہ ادارہ صرف مقامی احباب کی مدد سے چل رہا ہے۔

داخلہ میٹرک کے رزلٹ سے پہلے اور امتحان کے فوراً بعد

میٹرک کا امتحان دینے والے طلباء داخلہ لے سکتے ہیں۔ تاہم قبل ہونے کی صورت میں طالب علم کو فارغ کر دیا جائے گا۔

نصاب

سال اول: ترجمہ القرآن سورۃ الفاتحہ تا الاعراف، مشکوٰۃ اول، علم الخو، کتاب الخو، علم الصرف، ابواب الصرف، دروس الفتنہ العربیہ (دو حصے)، فرسٹ ایئر بمطابق انٹرمیڈیٹ بورڈ لاہور۔

سال دوم: ترجمہ القرآن سورۃ الاعراف تا النمل، مشکوٰۃ ثانی، نحو میر، شرح مائتہ عامل، کتاب الصرف، الطبیب، الحج، معلم الانشاء (دو حصے) سیکنڈ ایئر بمطابق انٹرمیڈیٹ بورڈ لاہور۔

سال سوم: ترجمہ القرآن، مسلم شریف، ترمذی شریف، ہدایہ الخو، علم الصیغہ، السراجی، شرح نخبۃ الفکر، تحریر انیر۔
سال چہارم: بخاری شریف، ہدایہ الوجیز، شرح ابن عقیل، الفوز الکبیر، فوجہ انیر نصاب، بمطابق پنجاب یونیورسٹی۔

ابو ہریرہ اکیڈمی کی نشریات، از قلم: میاں محمد جمیل

فہم القرآن: ابن کثیر، رازی، دیگر عربی تفاسیر کا خلاصہ اور تفسیر ثنائی، معاف مدبر، تفہیم القرآن کے اہم نکات پر مشتمل، جدید و قدیم علوم کا حکم جس میں رواں ترجمہ اور تفسیر باللہ یث کا التزام۔

امتیاز تفسیر: لفظی ترجمہ، آیت کے مسائل کی الگ الگ نشاندہی، ہر آیت کے مرکزی مضمون کی تفسیر بالقرآن کے ذریعے ایک مکمل تقریر۔ پہلے پندرہ پارے تین جلدوں میں دستیاب ہے۔ تفسیر کا آغاز 2005ء میں کیا گیا اور ہر سال پانچ پاروں پر مشتمل جلد پیش کی جا رہی ہے۔ ان شاء اللہ 2011ء میں مکمل ہو جائے گی۔

فہم اللہ یث: مشکوٰۃ المصابیح سے متفق علیہ اور بخاری و مسلم کی مکمل روایات۔ اس کے مطالعہ سے تعلیم یافتہ طبقہ کو 80 فیصد مسائل کسی عالم سے پوچھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

دیگر تصانیف: سیرت ابراہیم علیہ السلام، انبیاء علیہم السلام کا طریقہ دعا، دین تو آسان ہے، زکوٰۃ کے مسائل و فوائد، آپ ﷺ کا تہذیب و تمدن، مشکلات کیوں؟ نکلنے کے الہامی راستے، آپ ﷺ کا حج، مختصر مگر جامع، ہر کن کا فلسفہ، فضیلت قربانی اور اس کے مسائل، آپ ﷺ کی نماز (قیام و سجود کی عملی تصویر)، برکات رمضان، اتحاد امت و نظم جماعت، جادوی تباہ کاریاں..... ان کا شرعی علاج۔

ملنے کا پتہ: نعمانی کتب خانہ، مکتبہ سلفیہ، مکتبہ قدوسیہ، مکتبہ دارالسلام اردو بازار لاہور۔

میاں محمد جمیل، پرنسپل ابو ہریرہ شریعہ کالج، 37- کریم بلاک اقبال ٹاؤن لاہور۔ 042-5417233